والد کے نام

بیروت، اپریل 1902ء

مکرمی ابا حضور!

آپ کا مکتوب گرامی موصول ہوا، اور اس دل دوز خبر سے آگاہی ہوئی جس نے آپ کو ایسا تشویش ناک خط لکھنے پر مجبور کیا۔ اگر میں خط کی تاریخ مرقومہ پر نظر نہ ڈالتا تو یہ خبر میرے قلب وجگر کو بھی گھائل کر گئی ہوتی اور میں بھی خط بھیجنے والے کی نیت سے بے بہرہ رہتا۔ انہوں نے (عفی اللہ عنہ) آپ کو یہ اطلاع دی ہے کہ میری ایک بہن انتہائی علیل ہے اور اس کے علاج کے لئے ایک خطیر رقم درکار ہے۔ یقین فرمایئے کہ خط پڑھتے ہی میری چھوٹی حسن نے مجھے چونکا سا دیا اور میں نے فوراً تاریخ دیکھی، خط پر ''یکم اپریل'' درج تھا! یعنی یوم الحمقاء (April Fool) آپ تو جانتے ہی ہیں کہ محترمہ چچی صاحبہ کو اس نوع کے لطیف مذاق کی پرانی عادت ہے۔ اس بار انہوں نے ہمیں اپریل فول کا ہدف بنایا ہے۔ میری بہن کی علالت کی خبر صداقت سے اتنی ہی بعید ہے جتنی کہ چچی ہم سے دور ہیں۔

گزشتہ سات ماہ کے دوران مجھے مسٹر رے (Ray) کے پانچ مکتوب موصول ہوئے ہیں اور ہر خط میں انہوں نے مجھے یہی اطلاع دی ہے کہ مریانہ اور سلطانہ کی صحت قابل رشک ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان دونوں بہنوں کے اخلاق و کردار کے بھی بڑے مداح ہیں، خصوصاً سلطانہ کی عادات انہیں بہت پسند ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ہم دونوں بہن بھائی، یعنی میں اور سلطانہ، عادت واطوار اور جسمانی ہیئت میں ایک دوسرے کے مثیل ہیں۔

یہ الفاظ ایک ایسے انسان کے دل سے نکلے ہیں جس کی دیانت اور عظمت میں کوئی کلام نہیں۔ جسے اپریل فول کے علاوہ ہر اس مذاق اور جھوٹ سے نفرت ہے جو دوسروں کی رنجیدگی اور دل آزاری کا سبب نہیں!

میں ابھی تک بیروت ہی میں مقیم ہوں، ہوسکتا ہے کہ جلد ہی ایک امریکی خاندان کے ہمراہ شام، فلسطین یا مصر اور سوڈان کی سیاحت پر روانہ ہوجاؤں۔ دریں حالات میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ قیام کب تک رہے گا؟

اگر چہ میں اپنے مفادات کے لئے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں لیکن پھر بھی مجھے ان لوگوں کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جنہیں میرا مستقبل عزیز ہے اور جو مجھے تکریم وتوقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ براہ کرم اپنے دل کو شک وشبہات سے دور رہی رکھئے گا کہ مجھے اپنا مستقبل عزیز ہے اور اپنا نصب العین ہر لحظہ مدنظر ہے!

سبھی عزیز و اقارب کے لئے میرا سلام قبول فرمایئے اور جو کوئی بھی میرے متعلق استفسار کرے، اس سے مریا متو دبانہ سلام کہہ دیجئے گا۔ خدا آپ کو صحت بھری لمبی عمر عطا فرمائے۔ اور ہمیشہ اپنے حفظ و مان میں رکھے!

آپ کا بیٹا

جبران

☆☆☆☆☆☆

جمیل مالوف کے نام

بوسٹن 1908ء

عزیز جمیل!

تمہارا محبت نامہ موصول ہوا۔ اسے پڑھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے کمرے میں کوئی نسوں ساز روح حرکت کر رہی ہو، ایک حسین و غم گین روح! موج بحر کی طرح لہراتی ہوئی اس روح نے مجھے مسحور سا کر دیا، اور ایسے میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے تمہارا وجود دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ ایک وجود اپنے وسیع و عریض پروں کے ساتھ دنیائے انسانیت پر سایہ فگن ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ پر ان فرشتوں کے پروں ایسے ہیں جنھیں سینٹ جون نے سات چراغوں سے منور تخت کے سامنے کھڑا دیکھا تھا، اور دوسرا وجود گویا ''پرومی تھیوس'' کا ہے جو ایک مہیب چٹان کے ساتھ پا بہ جولاں ہے۔ وہی پرومی تھیوس، جو انسان کو آگ کی مشعل عطا کرنے کے جرم میں دیوتاؤں کے قہر و غضب کا نشانہ بنا تمہارا ایک پیکر میرے دل میں جا گزیں ہے اور میرے نفس کے لئے باعث تسکین ہے۔ وہ آفتاب کی شعاعوں اور نسیم سحر کے کیف پرور جھونکوں کے ساتھ ساتھ جھولتا ہے۔۔۔۔ تمہارا دوسرا پیکر، میرے قلب و جگر میں غم کے نشتر چبھوتا ہے کہ وہ دہر کے نشیب و فراز کا اسیر ہے!

میرا خیال ہے کہ ''پرومی تھیوس'' کی طرح تم بھی اس امر پہ قادر ہو کہ آسمانوں سے مشعل نور لے کر راہ انسانیت کو منور کر سکو! لیکن مجھے بتاؤ تو سہی کہ وہ کون سی قوت ہے جو تمہیں ساؤ پال (برازیل) لے گئی ہے اور جس نے تمہیں پابند سلاسل کر دیا ہے؟۔۔۔ وہ کون سی طاقت ہے جس نے تمہیں ان لوگوں کے درمیان جا پھینکا ہے کہ جن کا روز پیدائش اور اصل یوم مرگ ہے اور جن کے مردہ اجسام کو اب تک قبروں میں نہیں اتارا گیا! کیا یونانی دیوتا آج بھی سزا اور جزا کا کھیل رچائے ہوئے ہیں؟

شنید ہے کہ تم پھر سے پیرس جا کے رہنا چاہتے ہو، میری اپنی بھی یہی خواہش ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہماری آئندہ ملاقات ''شہر فنون'' پیرس میں ہو۔۔۔؟ پیرس، جو شہر فنون ہی نہیں، جان جہاں بھی ہے۔۔۔کیا وہاں ایک دوسرے سے مل سکیں گے؟ یقین جانو کہ میں اس ملاقات کا تہہ دل سے تمنائی ہوں، اس لئے کہ یہ ملاقات ہمیں فرانسیسی تھیٹر، اور دیپرا سے لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کرے گی۔ پھر ہم مراشیں، کورنیل، مولیر، یہوگو اور سار دو کی تمثیلات پر جی کھول کے گفتگو کرسکیں گے۔ پیرس میں ہماری رفاقت بہت پر لطف رہے گی۔ ہم دونوں چہل قدمی کرتے کرتے باستیل کے قلعے کے کھنڈروں تک جائیں گے اور جب ہم واپس ہورہے ہوں گے تو روسو، اور والٹیر کی حریت پسند روحیت ہم رکاب ہوں گی۔۔۔ پھر ہم آزادی اور جبر کے متعلق لکھیں گے اور ہر اس باستیل کو مسمار کر دیں گے جو مشرق کے ہر شہر میں ایستادہ ہے۔ ہم رافیل، دونشی اور کوروکی مصوری کے شاہکاروں سے محفوظ ہوں گے اور پھر ہم حسن وعشق اور قلب انسانی پر حسن وعشق کی فسوں سازی کے واقعات رقم کریں گے!

برادر من! میں شہہ پارہ ہائے فن کا شیدائی ہوں۔ اسے ایک ناقابل تسکین پیاس کی مثال سمجھ لو۔ میں لازوال دانش وحکمت کا متلاشی ہوں۔ جانتے ہو میری اس جستجو، اس پیاس اور اضطراب کا منبع کہاں ہے؟ یہ تمام جذبت اس عظیم قوت سے جنم لیتے ہیں جو میرے دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ ہے۔ یہ قوت اپنے اظہار کے لئے مضطرب ہے اور چاہتی ہے کہ لاوے کی طرح بہہ نکلے۔ لیکن یہ اس کے امکان سے باہر ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا، ابھی وہ ساعت دور ہے، اور وہ لوگ جن کی پیدائش ان کے لئے یوم مرگ ہے۔

وہ تا حال دفن نہیں کئے گئے اور زندوں کی راہ میں دیوار کی طرح حائل ہیں!

جیسا کہ تم جانتے ہو میری صحت اس وائلن کی مثال ہے جو ایک ایسے انسان کے

ہاتھ میں ہے جو نغمہ سازی کے رموز سے بے بہرہ ہے۔ وہ جب بھی اس کے تاروں کو چھیڑتا ہے تو اس میں سے ایک کرخت شور کے سوا کچھ نہیں پھوٹتا۔ میرے احساسات متلاطم سمندر کے مد و جزر کی طرح ہیں اور میرا نفس شکستہ پر طائر کی مثال ہے کہ جب وہ فضائے بسیط میں دوسرے طیور کو محو پرواز دیکھتا ہے۔ انہیں چہچہاتے ہوئے سنتا ہے تو اس کا دل بے بسی کے تیروں سے چھلنی ہو جاتا ہے۔

لکھتے لکھتے اکتا جاتا ہوں تو تصویریں بنانے لگتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنی تصویروں اور تحریروں کے درمیان میرا وجود ایک چھوٹی سی کشتی کی طرح ہے جو بے پایاں سمندر اور بے کراں فضا کے درمیان تیر رہو۔۔۔ نا دیدہ خوابوں اور ان جانی آشاؤں کے درمیان ۔۔۔ بلند امیدوں اور نا آسودہ حسرتوں کے درمیان، اور سب سے بڑھ کر اس اذیت کے درمیان کے جسے لوگ ''مایوسی'' کے نام سے پکارتے ہیں اور جو میرے نزدیک جہنم کی مثیل ہے۔

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام امین جرائب

بوسٹن 12 فروری 1908ء

عزیز امین!

تمہیں اور تمہارے احباب کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ میں آئندہ موسم بہار میں پیرس جا رہا ہوں۔۔۔۔پیرس۔۔۔۔جو فنون لطیفہ کا دل ہے اور جسے اصل جہان شہر فنون بھی کہتے ہیں۔۔۔۔ارادہ ہے کہ اپنی زندگی کا ایک سال پیرس کی آغوش لطف آفریں میں گزاروں، اور برسوں کی تشنہ روح کو مشروب قربت سے سیراب کروں گا اور ہاں، لطف کی ایک بات یہ بھی ہے کہ میری بہن مریانہ کے سوا، اور کوئی میرے اس پروگرام سے آگاہ نہیں ہے۔

اپنی زندگی کے یہ بارہ مہینے، جنہیں میں پیرس کی نذر کرنے والا ہوں، میری زندگی میں ایک سنہرے باب کا اضافہ کریں گے، اور وہ وقت کے جسے میں شہر ضیابار میں گزارنے چلا ہوں، اس کی ساعتیں، میری داستان حیات میں سطور زریں کی مثال ہوں گی، انشاءاللہ!

میری رمنا ہے کہ میں اس شہر بے مثال کے عظیم فنکاروں کی رفاقت میں ان کے فکروفن سے استفادہ کروں۔ ان کے مشاہدات ونظریات میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گے اور ان کی تعمیری تنقیدات میرے فن کو جلا بخشیں گی، ان کی قربت میرے لئے وجہ انبساط اور باعث سعادت ہوگی، ان کی قربت میری ذات کے لئے کس حد تک مفید ثابت ہوگی! اس کے متعلق ابھی سے کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔

البتہ یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ قیام پیرس کے بعد جب میں امریکہ لوٹوں گا تو میری تصویروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ میرے بارے میں کہا جائے گا کہ اس نے پیرس کے بے مثل فنکاروں کی سرپرستی میں مصوری کی ہے۔

میرے وہم وگمان میں یہ بھی بات نہ تھی کہ میں کبھی پیرس جاسکوں گا۔ اس کی وجہ تم

اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھ ایسا تنگ دست فنکار اتنے طویل سفر کے اخراجات کیوں کر برداشت کرسکتا ہے۔۔۔؟ لیکن قدرت نے مجھ پہ بے پایاں نوازش کی کہ میرے سفر کا تمام بندوبست مکمل ہو گیا ہے اور منزل میرے انتظار میں مضطرب ہے اور راستے بے قرار ہیں اور میرا اپنا دل مسرت سے یوں کپکپا رہا ہے جیسے پھول پہ بیٹھی ہوئی تتلی کے پر کپکپا رہے ہوں۔ میرے پورے وجود پر مسرت کا لرزہ سا طاری ہے۔ ایسی اضطراب بھری مسرت کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہے!

میں وہاں پورا ایک سال گزاروں گا۔۔۔ زندگی کا ایک مکمل دور اور اس ایک سال کے عرصے میں میں وہاں سے بہت کچھ حاصل کروں گا اور یہ سال میری زندگی میں کسی مقدس تہوار کی طرح زندہ رہے گا۔

اب آؤ میرے بوسٹن کے قیام کی روداد بھی سن لو، میں بوسٹن میں اس لئے قیام پذیر نہیں ہوں کہ یہ نیویارک سے بہتر یا حسین شہر ہے اور نہ ہی اس قیام کا یہ مطلب ہے کہ مجھے امریکہ سے محبت ہے! اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں (بوسٹن) مجھے ایک فرشتہ سیرت خاتون کی رفاقت حاصل ہے۔ اس فرشتہ سیرت خاتون نے میرا مستقبل تابناک بنا دیا ہے اور اس کی رفاقت اور ہمدردی کے سہارے میں نہ صرف دانش کے موتی سمیٹ رہا ہوں بلکہ معاشی طور پر آسودگی محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ لیکن اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا کہ میں بوسٹن میں رہوں یا پیرس میں۔۔۔ اس لئے کہ میری جنت تو "المہاجر" ہے کہ جس کے صفحات پر میری روح نغمہ سرا ہوتی اور میرا دل رقصندہ رہتا ہے۔ المہاجر، میرا فردوس ہے اور اس کی حدود سے خروج کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔

مجھے یقین ہے کہ میں پیرس میں قیام کے دوران میں کچھ ایسی تخلیقات پیش کر سکوں گا جو امریکہ کے صنعتی اور تجارتی شہروں کے شوروشغب میں ممکن نہیں ہیں۔ یہ قیام اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوگا کہ اس کے دوران میں عمرانی علوم سے

بہرہ ور رہوں گا اور مجھے اس شہر کی رفاقت میسر ہو گی جسے شہرِ فنون کہا جاتا ہے اور جس کی فضا میں روسیو، لامیر طینے اور ہیو گیو کی سانسیں بسی ہوئی ہیں اور جہاں کے رہنے والے فنونِ لطیفہ سے ایسی ہی والہانہ محبت کرتے ہیں جیسی کہ اہلِ امریکہ کو ''ڈالر '' سے ہے۔ ڈالر، جسے اہلِ امریکہ ''قادرِ مطلق'' سمجھتے ہیں!

تمہاری عدم موجودگی میں بھی میں ''المہاجر'' کی قلمی معاونت جاری رکھوں گا اور اس کے صفحات کو اپنے قلب و روح کی تمام تر محبت و عقیدت، افکار و نظریات اور امیدوں اور تمناؤں سے مزین کرتا رہوں گا۔ تمہارے لگائے ہوئے ہیں اس پودے کو میں اپنے خونِ جگر سے سینچوں گا، اپنی روح کے جذبوں سے اس کی آب یاری کروں گا۔ اس لئے کہ دوستی میں یہی رسم مستحسن سمجھی گئی ہے، دوستی یا محبت ایثار نفس اور خود کو قربان کر دینے کا نام ہے۔ تم میرے دوست ہو اور مجھے صرف اور صرف تمہاری دوستی چاہئے۔ اور بس! تمہاری دوستی میرے لئے تختِ سلیمان سے بڑھ کے سعیدِ عظیم ہے اور اگر تم میری خدمات اور معاونت کا کچھ مادی فائدہ دینا چاہتے ہو تو یوں کرو کہ میری تازہ ترین تخلیق ''اشک و تبسم'' (Tears and Laughter) کو روشناس کرانے میں میری مدد کرو۔ اپنے ادارتی عملے سے کہو کہ وہ ''اشک تبسم'' پر بے لاگ اور عالمانہ تنقید لکھیں اور اس کی فروخت میں مجھ سے تعاون کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''المہاجر'' کے تعاون کے بغیر میری کتاب امریکی تاجروں میں متعارف نہیں ہو سکتی! عربی کے قارئین بھی اسے تمہارے جریدے ہی کی وساطت سے پہچانیں گے!

اس کی نغمہ بار آبشاروں اور گنگناتی ندیوں سے حظ اٹھاؤ اور ہرے بھرے جنگلات میں گھومو پھرو۔ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تمہیں اپنے وطن کی قربت میسر ہے۔

وہ راحت آفریں قربت، کہ جس کے لئے میرا دل ہر لمحے ترستا اور تڑپتا رہتا ہے، وہ مسرت بھری قربت کے جس کے لئے میری روح ہمہ وقت مضطرب و بے قرار رہتی

ہے۔

مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچا کہ یہ سوچ تمہارے حال کی سکوں آفرینیوں کو چھین لیتی ہے۔ جو ہونا ہے ہو کے رہے گا۔ کل کی فکر کے خنجر سے آج کی مسرت کا گلا مت کاٹو! ''المہاجر'' عربی صحافت کے لئے باعث افتخار ہے اور آنے والے دور میں بھی اس کا افتخار قائم رہے گا! تمہارا صرف ایک پیغام، اسد رستم کی ایک نظم اور جبران کا ایک نثری مضمون ہر ہفتے عرب دنیا کی آنکھیں کھولتا رہے گا اور پڑھنے والوں کا ذہن نمبر 21 واشنگٹن اسٹریٹ کی سمت محو پرواز رہے گا!

میری کتاب ''سرکش روحیں'' کے بارے میں تعارفی تبصرہ مجھے بہت پسند آیا، اس لئے کہ اسے لکھتے وقت تم نے ذاتیات کو قطعی نظر انداز کر دیا ہے اور پڑھتے وقت کسی مقام پر بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ جبران تمہارا دوست ہے اور یہی اس تبصرے کی سب سے بڑی خوبی ہے! گزشتہ پیر کو میں نے تمہیں المہاجر کے لئے ایک مضمون بھیجا تھا، کہو مل گیا ہے کہ نہیں۔۔۔۔؟ جب تک تم لبنان میں ہو، میں تمہیں ایک مکتوب اور بھیجوں گا۔ اس بات پر اس قدر متاسف ہونے کی ضرورت نہیں کہ میری تمہاری ملاقات نہیں ہو سکی! یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بغل گیر نہیں ہو سکتے، ایک دوسرے کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دے سکتے، لیکن اس پر محزون نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے خیالات اور ہماری روحیں تو ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ سات ہزار میل کا فاصلہ اور ایک ہزار برس کا بعد۔۔۔۔ روح کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔۔۔۔! ان کی حیثیت ایک میل اور ایک سال سے زیادہ نہیں ہے!

مریانہ تمہیں آداب کہتی ہے اور تمہاری کامیابی کے لئے دعا گو ہے۔ خداوند کریم تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور بہ حفاظت واپس لائے، اور تم پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نچھاور کرے، اور یہ برکتیں اور رحمتیں اتنی ہوں کہ جتنی مجھے تم سے محبت اور عقیدت ہے!

جبران

بنام نخلی جبران

بوسٹن 15 مارچ 1908ء

عزیز من نخلی!

ابھی ابھی تمہارا پیار بھرا مکتوب موصول ہوا ہے۔ اسے پڑھ کے مجھ پر بیک وقت غم اور مسرت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسے پڑھتے ہی ایام رفتہ تصویریں ذہن کے پردے پر روشن ہوگئیں۔ ان ایام رفتہ کی تصویریں کے جو خوابوں کی مانند محو ہو گئے۔ وہ گزری ہوئی ساعتیں، جو اپنے پیچھے یادوں کے، ایسے بھانک ہیولے چھوڑ گئیں ہیں جو طلوع سحر کے ساتھ نمودار ہوتے اور غروب آفتاب کے ساتھ غائب ہو جاتے ہیں!

وہ ایام کیا ہوئے اور وہ شب ہائے ماضی کہاں گئیں کہ جن کی آغوش میں پطرس کی سانسیں بسی ہوئی تھیں ۔۔۔۔ کیا وہ ختم ہو گئیں؟ صفحہ ہستی سے محو ہو گئیں؟؟ وہ لمحات کیا ہوئے کہ جن میں پطرس کے دلنواز نغمے اور اس کی رعنائیاں رچی ہوئی تھیں ۔۔۔ کیا وہ آغوش ماضی میں خفتہ ہیں یا عدم کے پروں میں چھپ گئے ہیں ۔۔۔؟ ہاں ۔۔۔۔

وہ دن، وہ راتیں اور وہ ساعتیں، خزاں رسیدہ پتوں کی طرح نجانے کس سمت اڑ گئی ہیں؟ مجھے خبر ہے کہ وہ دن اور وہ راتیں تمہیں بھی یاد ہیں ۔۔۔ ان کا کرب اور حزن وملال تمہاری روح میں بھی بسا ہوا ہے ۔۔۔ تم بھی ان کرب ناک یادوں سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے۔ میری طرح تم بھی یادوں کے نوکیلے اور اذیت ناک پنجو ں میں جکڑے ہوئے ہو ۔۔۔ تمہارے خط کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ ماضی کے کرب میں بسا ہوا ہے ۔۔۔ تم نے اپنی جس محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ بھی تمارے مکتوب کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے اور مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ الفاظ نہیں ہیں محبت اور خلوص کے پیکر ہیں جو براز یل سے اڑ کے یہاں آئے ہیں

کہ میرے دل کو بشریٰ کی نغمہ سرا ندیوں، گنگناتے چشموں اور سرسبز وادیوں اور پر شکوہ چٹانوں کی بازگشت سے لب ریز کر دیں۔

زندگی، سال بھر کے موسموں کی مثال ہے۔ خوشگوار اور شاماں گرما کے بعد دکھ بھری خزاں پر پھیلائے آ پہنچتی ہے۔ اس کے بعد کڑکڑاتا ہوا جاڑا آتا ہے اور پھر موسم بہار آ جاتا ہے۔ گل پاشیاں کرتا ہوا، خوشی کی تانیں اڑاتا ہوا اور امنگ بھرے گیت الاپتا ہوا۔۔۔ اپنے دامن میں رعنائیاں اور دلفریبیاں سمیٹے ہوئے اور طائران نغمہ سرا کے کارواں لئے ہوئے!

کیا ہماری زندگی کا موسم گل ایک بار پھر آئے گا کہ ہم جھومتے ہوئے پیڑوں کے ساتھ مسرت کے جھولے جھول سکیں؟ پھولوں کے ساتھ مسکرا سکیں، ندیوں کے ساتھ ساتھ بھاگ سکیں اور طائران نغمہ سرا کے ساتھ ساتھ خوشی کی تانیں اڑا سکیں، کہ جیسے ہم بشریٰ میں کیا کرتے تھے اور جب پطرس بھی ہمارے درمیان موجود ہوتا تھا! کیا وہ طوفان، جس نے ہمیں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھیر کے رکھ دیا ہے ایک بار پھر ہمیں یک جا کر دے گا؟ کیا ہم ایک بار پھر بشریٰ واپس جا سکیں گے؟ میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں! لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی گویا ایک قرض خواہ کی مثیل ہے۔ وہ ہمیں ''امروز'' دیتی ہے لیکن ''فردا'' کو واپس لے لیتی ہے۔ وہ ایک دن بیچتی ہے تو ایک دن واپس لے لیتی ہے اور یہ چکر یوں ہی چلتا رہتا ہے حتیٰ کہ ہم اس لین دین سے نڈھال ہو کے موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں!

تم جانتے ہو کہ جبران کی زندگی کا اکثر حصہ قلم کی ریاضت میں گزرا ہے اور اس فن کے لئے اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عزیزوں سے خط و کتابت کو اپنے فن پر ترجیح دیتا ہے اور اس میں اسے ایک خاص قسم کی حلاوت اور اطمانیت محسوس ہوتی ہے مجھے تم سے بچپن میں بھی پیار تھا اور اب کہ تم ایک تناور درخت کی طرح جوان ہو، پھر بھلا میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں!

بچہ، جس شے سے محبت کرتا ہے وہ زندگی کے آخر سانسوں تک اس کے ذہن میں بس رہتی ہے اور جن فضاؤں میں ہم نے عہد طفولیت گزارا ہوتا ہے، وہ تا حیات ہمیں یاد رہتی ہیں اور ہماری روحیں ان پر ہمیشہ منڈلاتی رہتی ہیں۔ جن گلیوں اور جن فضاؤں میں میرا بچپن بیتا ہے وہ اب بھی میرے ذہن میں چاند کی طرح روشن ہیں اور ان کی سرگوشیاں آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔۔۔۔ ماضی کی یادیں میری روح کے آسمان پر تابندہ ستاروں کی طرح ہیں اور ان پر فراموشی کے ابر کبھی نہیں چھائے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی یادیں کبھی کبھی مجھے رلانے لگتی ہیں! میری یادیں غم اور مسرت سے آمیز ہیں اور اگر مجھے کہا جائے کہ میں دونوں میں سے ایک کا انتخاب کروں تو یقین جانو کہ میں اپنے غم کو دنیا بھر کی مسرتوں سے بھی نہیں بدلوں گا!

میرا خیال ہے کہ ماضی کے چہرے پر نقاب ڈال کے اب مجھے حال اور مستقبل کے بارے میں بات کرنی چاہئے۔ وہ لڑکا، جسے تم جبران کے نام سے جانتے ہو، وہ بھی تمہاری طرح بلوغت کے دور سے گزر رہا ہے، اب ذرا اس کے متعلق سنتے جاؤ!

میرا جسم اگر چہ اتنا مضبوط نہیں تاہم میری صحت بہت اچھی ہے اس لئے کہ میں نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ سگریٹ پیتا ہوں اور کافی بھی نوش کرتا ہوں۔ اگر اس وقت اور اسی لمحے تم میرے کمرے میں آ جاؤ تو دیکھو گے کہ میرا کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا ہے اور اس میں یمنی کافی کی مہک بھی بسی ہوئی ہے۔ مجھے کام سے محبت ہے، لکھنے اور تصویریں بنانے سے عشق ہے اور میں ایک ایک لمحے سے مستفید ہوتا ہوں۔ بیکار بیٹھے اور وقت ضائع کرنے سے مجھے شدید نفرت ہے۔ میری زندگی کے وہ ایام جو کہ بے کاری اور غفلت میں گزرے ہیں، ان کی یاد کونین سے زیادہ تلخ اور بھیڑیئے کے نوکیلے دانتوں سے زیادہ اذیت ناک ہے۔ میری زندگی لکھنے اور تصویریں بنانے میں میں بیت رہی ہے اور مجھے اپنے ان دونوں

کاموں سے والہانہ عشق ہے۔ اور اس عشق میں کسی تیسرے شے کی شراکت نہیں ہے۔ میرے جذبات و خیالات میں جو آگ پوشیدہ ہے اسے میں سیاہی کے سہارے کاغذ پر بکھیرتا رہتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ عربی کے قارئین مجھ سے اپنی محبت اور عقیدت کا رشتہ استوار رکھیں گے۔ یہ بات میں یوں ہی نہیں کہہ رہا کہ میری مخالفت میں آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ اہل شام مجھے کافر اور زندیق کہہ کر پکارتے ہیں اور مصر میں مجھے حق و انصاف کے قوانین کا دشمن بتایا جا رہا ہے۔ انسانی رشتوں کا مخالف اور کہنہ روایات کا باغی کہا جا رہا ہے۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ میں انہیں راستی پر سمجھتا ہوں مجھے واقعی حق و انصاف کے قوانین سے نفرت ہے، میں انہیں پسند نہیں کرتا، میں ان کا باغی ہوں، ان کا منکر ہوں اور انہیں دفن ہوتے ہوئے دیکھنے کا متمنی ہوں۔۔۔۔ مجھے روایات سے نفرت ہے، میں نے روایات کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا ہے۔ لیکن میری نفرت انسان کے تراشے ہوئے قوانین کے خلاف ہے، میری خواہش ہے کہ زمین پر سماوی قوانین کی حکمرانی ہو، روحانی ضابطہ حیات جاری و ساری ہو۔ ہر انسانی قانون کی بنیاد روحانی شفقت و خلوص پر ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ شفقت انسان کے اندر خدا کا عکس جمیل ہے۔ میں ان تمام اصولوں اور ضابطوں سے آگاہ ہوں کہ جن پر میری تحریریں استوار ہیں اور جن کی صدائے بازگشت میری ہر تحریر میں گونجتی ہے۔ یہ صدائے بازگشت دنیا کی عظیم روحانی شخصیات کی تعلیمات سے لبریز ہے۔ روحانیت ہماری زندگی کے لئے اتنی ہی لازمی ہے جتنی کہ جسم کے لئے دل۔۔۔۔ کیا میری تعلیمات عرب دنیا میں قبول کی جائیں گی۔۔۔۔؟ یا پھر کسی سائے کی طرح معدوم ہو جائیں گی؟

کیا میں لوگوں کی نظریں روایات کی کھوپڑیوں اور کانٹوں سے ہٹا کے صداقت اور ہدایت کی سمت میں ملتفت کر سکوں گا؟ کیا میرا انجام ان لوگوں کا سا تو نہیں ہو گا

جو اپنی زندگی کا نشان چھوڑے بغیر عدم کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔۔۔۔!
میرے پاس اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔لیکن لگتا ہے کہ میرے دل کی گہرائیوں میں ایک عظیم قوت باہر آنے کے لئے مضطرب ہے اور خدا نے چاہا تو یہ قوت ایک نہ ایک روز ضرور باہر آئے گی اور خدائے ذوالجلال کی اعانت سے میسر ہوگی!

آئندہ جون کی یکم کو میں پیرس جا رہا ہوں۔ارادہ ہے کہ میں ایک سال تک وہیں رہوں گا اور وہاں کے لئے بے مثل گنکاروں کے رفاقت اور صحبت میں بہت کچھ حاصل کروں گا۔اور اس کے بعد میری زندگی ایک نئے باب میں داخل ہوگی۔

اپنی رفیقہ حیات سے میرا سلام کہہ دینا اور بچوں سے میرا تعارف یوں کرانا کہ یہ جبران تمہارا بہت قریبی عزیز ہے اور تم سب کو اس نے اپنے دل میں بٹھا رکھا ہے۔
میری ہمشیر مریانہ تمہیں آداب کہتی ہے۔یقین جانو کہ تمہارا خط سن کر وہ اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکی۔ایام رفتہ کی یادوں نے اسے اشکبار کر دیا۔۔۔۔خدا تمہیں صحت و زندگی سے نوازے اور ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام امین جرائب

بوسٹن 28 مارچ 1908ء

عزیزی امین!

میرے اردگرد دھوئیں کے بادل بکھرے ہوئے ہیں اور ان میں یمنی کافی کی مخصوص مہک بھی رچی ہوئی ہے۔ جانتے ہو یہ دھوئیں کے بادل کہاں سے آئے ہیں۔۔۔؟ مجھے معلوم ہے تم جواب میں کیا کہو گے۔ ہی نا کہ دھوئیں کے یہ دل سگریٹ نوشی کا نتیجہ ہیں۔تمہارا جواب ٹھیک ہے لیکن تم یہ نہیں بتا سکتے کہ میں نے خود کو دھوئیں کے ان بادلوں میں کیوں چھپالیا ہے۔۔۔! اس کی وجہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میں نے ارادتا ایسا کیا ہے کہ تم سے جی بھر کے باتیں کرسکوں۔ کافی اور سگریٹ میری تنہائی کے رفیق ہیں اور مجھے ہمیشہ چاک وچو بند رکھتے ہیں!

تم اس وقت مشرق میں ہو اور میں مغرب میں ہوں۔۔۔تم لبنان کی دلفریب وادیوں میں زندگی سے محفوظ ہو رہے ہو اور میں یہاں، اس شہر میں ہوں کہ جہاں قیامت کا سا شوروغل بپا ہے، تمہیں سکون میسر ہے اور میں اضطراب کی آگ میں پھنک رہا ہوں۔۔۔۔۔ بے شک تم مجھ سے بہت دور ہو لیکن یہ فاصلہ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور میں تمہیں خود سے اتنا قریب پاتا ہوں جتنا کہ مجھ سے میرا دل قریب ہے۔ دوستوں اور رفیقوں کی جدائی کا اکثر لوگوں کو شاق گزرتی ہے لیکن جدائی صرف کے لئے حزن و ملال کا باعث بنتی ہے جو ہر شے کو حواس خمسہ کے ذریعے سے محسوس کرتے ہیں۔ میرا معاملہ ان لوگوں کے برعکس ہے۔ میری روح اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں اسے حواس خمسہ کی احتیاج نہیں رہی۔ وہ اس منزل پہ ہے جہاں قرب وبعد بے معنی الفاظ بن جاتے ہیں۔ مجھے اب حواس خمسہ کی احتیاج نہیں رہی۔ وہ اس منزل پہ ہے جہاں قرب وبعد بے معنی الفاظ بن جاتے ہیں۔ مجھے اب حواس خمسہ کی ضرورت نہیں رہی۔ میری روح سمیع وبصیر بھی اور علیم وخبیر

بھی۔۔۔۔لیکن یہ آنکھوں کے ذریعے دیکھتی ہے نہ کانوں کے ذریعے سنتی ہے۔یہ اشیاء کے وجود کو بھی محسوس کرتی ہے لیکن قوت لامسہ سے بے نیاز ہے اسے بے نیاز ہے اسے آنکھوں، کانوں اور ہاتھوں کی اعانت کی ضرورت نہیں رہی!

میری روح ایک ثانیے میں ہوری کائنات کا چکر لگا سکتی ہے، اسے کاروں اور طیاروں اور سفینوں کی ضرورت نہیں۔تم میری آنکھوں سے دور لیکن میری روح کے سامنے موجود ہو، یعنی تم مجھ سے بیک وقت دور بھی ہو اور نزدیک بھی۔۔۔۔روح ان اشیاء کی دید پر بھی قادر ہے جو بصارت سے ماورا ہوتی ہیں اور ان بے آواز نغموں کی سماعت کی طاقت بھی رکھتی ہے جو سماعت سے ماورا ہوتی ہے۔زندگی کی سچی رعنائیوں وہی ہیں جو سماعت وبصارت سے ماوراور بے نیاز ہوتی ہیں!

لبنان ان دنوں کس حال میں ہے؟ کیا اسی طرح دل فریب ہے جیسے کہ پہلے تھا؟ یا کسی بے آب و گیاہ صحرا میں تبدیل ہو چکا ہے کہ جہاں وحشت اور جمود کے سائے رقصندہ ہوں۔کیا لبنان اب بھی وہی لبنان ہے کہ جس کے حسن و رعنائی کے قصید ے حضرت داؤد علیہ السلام نے گائے تھے یا اس کا حُسن داغ دار ہو چکا ہے؟ کیا اس کی وادیاں اور چوٹیاں پہلے ہی کی طرح سرسبز اور دل کش ہیں کہ خشک میدانوں اور جھلتی ہوئی چٹانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔۔۔۔؟

تم ان تمام سوالوں کے جوب ''المہاجر'' میں بذریعہ تحریر دو گے!اور ہونا بھی یہی چاہئے کہ المہاجر میں لبنان کے متعلق تفصیل سے لکھا جائے۔البتہ اگر کوئی اہم ذکر ہو تو براہ کرم اپنے جوابی مکتوب میں اسے لکھ دینا کہ میں لبنان کو تمہاری آنکھوں سے بھی دیکھ لوں گا۔

میں عنقریب فرانس کے لئے روانہ ہو جاؤں گا اور ایک سال تک ''شہر علم' یعنی پیرس میں مقیم رہوں گا۔اس اثنا میں میں اپنے فن میں کلاسیکی خدوخال کا اضافہ کر لوں گا۔پیرس کے بعد میرا ارادہ اطالیہ جانے کا ہے۔اطالیہ آثار قدیمہ کا گھر ہے،

وینس، فلورنس اور روم کی سیاحت سے محفوظ ہونے کی تمنا ہے۔ بعد ازاں نیپلز ہوتا ہوا امریکہ لوٹ آؤں گا۔ یہ بڑا ہی سحر آفریں اور دلچسپ سفر ہوگا۔ اسے میرے کرب ناک ماضی اور خوش آیند مستقبل کے درمیان ایک سنہری زنجیر کی حیثیت حاصل ہو گی۔

مجھے یقین ہے کہ تم امریکہ جاتے ہوئے پیرس سے ضرور گزرو گے؟ اور پھر خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو، والی بات ہو گی۔۔۔۔پیرس کی فنی رعنائیاں ہماری تشنہ روحوں کے لئے مشروب تسکین مہیا کریں گی۔ پیرس میں ہم وکٹر ہیوگو، روسیو اور رینا ساں کے مزاروں پر مئودب حاضری دیں گے۔ پیرس میں ہم رافیل، مائیکل انجلو اور ڈی ونچی کے مصوری کے شاہ کاروں کی دید سے مستفیض ہوں گے۔ بیتھیون، ویگنر، موزارٹ، روزینی اور دی بیوزی کے غنائیوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

یہ ان عظیم شخصیات کے نام ہیں جنھوں نے تہذیب یورپ کی بنیاد رکھی، اور یہ وہ نام ہیں جنھیں، زمین مدت ہوئی، نگل چکی ہے لیکن جن کے کارنامے زوال اور فنا سے ماوراء ہیں۔ زمین انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکی۔ طوفان، گلاب کی پتیوں کو تو ضرور بکھیر سکتا ہے لیکن بیج کو فنا نہیں کر سکتا۔ یہی وہ راز ہے جسے قادر مطلق عظیم انسانوں کے دلوں میں اتارتا ہے اور وہ اپنے پیچھے کارناموں کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ یہی وہ روشنی ہے جس کے سہارے آبنائے دانش جادہ حیات پر گامزن رہتے ہیں۔

میرا اندازہ ہے کہ میرے دوست سلیم سارکیس نے تمھیں بتا دیا ہوگا کہ لطفی المنفلوطی نے میری کہانی ''گل بدن'' پر بہت ہی متوازن اور غیر جانبدارانہ تنقید کی ہے جو ''المیاذ'' میں شائع کی ہے۔ یہ تنقید بہت اچھی ہے اور اس نے مجھے نئی راہ دکھائی ہے۔ اس لئے کہ یہ تنقید لطفی المنفلوطی ایسے جید صاحب قلم کی مرہون منت ہے!

تمہیں یہ جان کر مسرت ہو گی کہ میں نے اپنی زندگی کو پرانے غلاف سے آزاد کر لیا ہے اور پرانا رستہ ترک کر دیا ہے۔ میرے ''دیروز'' اور ''امروز'' میں تحیر خیز تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ میری روح نئے جذبوں اور انوکھی امنگوں سے ہم کنار ہوئی ہے، اور یہ تغیر عظیم پیرس کے عزم سفر کا رہین منت ہے۔۔۔ کل تک میں زندگی کے محدود اسٹیج پر اپنے حقیر کردار پر صابر، شاکر اور مطمئن و مسرور تھا لیکن آج میں نے یہ جان لیا ہے کہ میرا کل کا اطمینان اور قناعت، بے عملی اور کاہلی کے سوا کچھ نہ تھا۔

کل تک میں زندگی کو ''اشک و تبسم کی نظر سے دیکھتا تھا، لیکن آج مجھے زندگی سنہری کرنوں کے دوش پر سوار شاداں و فرحاں دکھائی دیتی ہے اور اس نے میرے قلب و روح میں عزم و رجا کی قندیلیں روشن کر دی ہیں۔ میں ایک اسیر پرندے کی طرح زندگی کے قفس میں بند تھا اور ان بیجوں پر قناعت کیے ہوئے تھا جو دست قضا میرے قفس میں بکھیرتا تھا، لیکن آج میں اس قفس سے آزاد ہو گیا ہوں اور میں نے یاس آمیز قناعت کا لبادہ اتار پھینکا ہے اب میں اس آزاد پرندے کی طرح ہوں جو سر سبز وادیوں اور برف پوش چوٹیوں پر محو پرواز ہے۔۔۔ جو قناعت کے محدود قفس سے نکل کے عزم کے خلائے بسیط میں پر فشاں ہے!

ہماری زندگی میں ایک جذبہ ایسا بھی ہے جو شہرت کے میناروں سے کہیں اونچا اور روشن ہے اور وہ جذبہ ہے کسی کارنمایاں کی تمنا۔۔۔ کسی انمٹ تخلیق کا اور کسی غیر فانی عمل کا۔۔۔ خود میرے اندر ایک ایسا ہی جذبہ مضطرف و منتظر ہے کہ جب وہ میرے قلب سے باہر آئے تو میں اس کی مقدس عریانی کو کسی کارنمایاں۔ یا کسی لافانی تخلیق کی خلعت سے ڈھانپ لوں۔۔۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں صفحۂ ہستی پر اپنا نام جلی حروف میں لکھنے کے لئے اس دنیا میں بھیجا گیا ہوں۔۔۔ یہ جذبہ مجھے شب و روز اضطراب کی آگ میں جلاتا ہے اور مجھے اپنا مستقبل درخشاں و فروزاں دکھائی دیتا ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ آئندہ موسم گرما میں اپنی کتاب ''ٹوٹے ہوئے پر'' شائع کرادوں! ''ٹوٹے ہوئے پر'' میری اب تک کی سب سے بہترین تخلیق ہے۔

جب تم کسی باغ میں گھوم رہے ہو، یا آثار قدیمہ کی سیر میں مصروف ہو، کسی سے محو گفت وشنید ہو۔۔۔۔یا پھر کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایستادہ ہو تو ایسے میں، ہولے سے میرا نام بھی دہرا دینا کہ اس طرح میری روح بھی لبنان کے قدرتی حسن و جمال سے محفوظ ہو سکے گی۔

جب تم آفتاب کو طور سینین کے عقب سے طلوع ہوتے ہوئے دیکھو تو مجھے بھی یاد کر لینا کہ تمہارے ساتھ ساتھ میری روح بھی اس سحر آفریں منظر سے لطف اندوز ہو سکے!

جب تم دیکھو کہ آفتاب غروب ہونے جا رہا ہے اور اس نے اپنی احمریں چادر، پہاڑیوں اور سبزہ زاروں پر پھیلا دی ہے اور لبنان کی سرزمین سے رخصت ہوتے وقت اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں ہیں تو ایسے میں اپنے اس دور افتادہ رفیق کو بھی یاد کر لیا نا!

جب تم دیکھو کہ کوئی چرواہا صنوبر کی چھاؤں تلے بیٹھا اپنی لے سے مدھر نغمے بکھیر رہا ہے اور خاموشی کے سینے میں ہلچل مچا رہا ہے تو اس گھڑی مجھے بھی آواز دے دینا!

جب تم دیکھو کہ دوشیزائیں چشموں سے پانی بھر کے لوٹ رہی ہیں اور ان کے کندھوں پر چھلکتی ہوئی صراحیاں رکھی ہوئی ہیں اور وہ قطار قطار چل رہی ہیں اور ان کے حوروں ایسے جسم لہراتے اور بل کھاتے ہوئے حرکت کر رہے ہیں تو اس ساعت سعید میں مجھے بھی پکار لینا!

جب تم کسی کسان کو دیکھو کہ کڑی دھوپ میں زمین کا سینہ چیرنے میں مصروف ہے اور محنت کے بوجھ نے اس کی کمر خمیدہ کر دی ہے تو ایسے میں میری روح کو بھی بلا

لینا۔

جب تم فطرت کے حلاوت بھرے نغمے سنو، چاندنی راتوں کی دودھیا مہک آفریں فضا میں مشروب حیات پی رہے ہو، تو مجھے بھی شریک کرلینا!

جب لوگ تمہیں مدعو کریں اور تمہاری قربت کو وجہ افتخار سمجھیں تو مجھے بھی یاد کرلینا کہ تمہارے ساتھ میں شرکت محفل کی سعادت پالوں گا۔۔۔۔اس لئے کہ جب کوئی تمہیں اپنے ہاں مدعو کرتا ہے تو گویا اپنی بے پایاں محبت اورعقیدت کا اظہار کرتا ہے اور یہ تو جانتے ہی ہو کہ محبت اورعقیدت زندگی کے دو مقدس جذبے ہیں اور ان کے بغیر زندگی خوشبو سے عاری پھولوں کی طرح ہے۔

یہ چند سطور لکھ دینے کے بعد مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس بچے کا مثیل ہوں جو سمندر کے پانی کو ایک سیپ کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کررہا ہو اور اس پانی کو ساحل پہ کھدے ہوئے ایک ریتلے گڑھے میں انڈیل رہا ہو!

میں نے یہ سطور روح کی انگلیوں اور دل کی سیاہی کے ساتھ محبت کے چہرے پر رقم کی ہیں اور یہ چہرہ ارض و سما کے درمیان معلق ہے اور مشرق سے مغرب تک جھلملا رہا ہے!

اپنے والدین سے میرا آداب کہہ دینا۔۔۔۔وہ والدین کہ جنہوں نے عرب دنیا کو تم ایسی عظیم و سعید ہستی سے نوازا ہے اور جس نے لبنان کو اپنے دل کی مشعل سے تاباں کر دیا ہے اور جبران کو ایک بے لوث اور محبوب رفیق سے نوازا ہے! اپنے ہمسایوں اور بہن بھائیوں سے بھی میرا اسلام کہہ دینا۔۔۔۔یہ سلام نسیم سحر کی مثال ہے جو سیب کے شگوفوں کی مہک چرا کے ہر شے کو مہکاتی چلی جاتی ہے۔مریانہ تمہیں سلام کہتی ہے اور میرے دیگر احباب بھی تمہارے لئے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔۔۔۔سبھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام یوسف حویک

بوسٹن 1911ء

رفیق!

اگر چہ یہ شہر (بوسٹن) دوست واحبات سے بھرا پڑا ہے اور میری دل جوئی کرنے والے بہت ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں ایک ایسی جگہ آ گیا ہوں کہ جہاں زندگی برف کی طرح سرد، راکھ کی طرح بھوری اور ابوالہول کی طرح مہ بہ لب ہے۔۔۔۔پرسکوت اور گم سم ہے۔

میری ہمشیری ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے اور عزیز و اقارب مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔شب و روز ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود میں خوش نہیں ہوں۔۔۔۔خوشی نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔۔۔۔؟میرا فن روز بروز ارتقاء پذیر ہے۔۔۔۔میرے خیالات میں کوئی ہیجان نہیں، اور صحت بھی میری خاصی اچھی ہے۔۔۔۔لیکن پھر بھی مسرت مجھ سے دور ہے۔۔۔۔میری روح تشنہ ہے اور اسے کوئی مشروب تسکین چاہئے۔۔۔۔مگر معلوم نہیں کہ ایسا مشروب کہاں سے آئے گا۔۔۔۔؟کون لائے گا۔۔۔۔؟روح ایک ساوی پھول ہے، تاریکی میں اس کی نشوونما رک جاتی ہے۔۔۔۔لیکن اس کے برعکس کانٹے ہر جگہ اگ سکتے ہیں، بڑھ سکتے ہیں اور پھیل سکتے ہیں۔

یہ ہم اہل مشرق کی زندگی کا ایک مختصر سا نقشہ ہے۔۔۔۔فنون لطیفہ کی محبت ہمارے لئے جان لیوا روگ بن جاتی ہے۔۔۔۔یہ نقشہ اپالون کے بچوں کی زندگی کا بھی ہے کہ جو اپنی مادر وطن سے ہجرت کرکے غریب الوطن ہوئے پھرتے ہیں جو ہر جگہ اجنبی ہیں۔جن کا فن ہر جگہ اجنبی ہے۔اور جب کہ قہقہوں میں ان کے دل کا کرب چھپا ہوا ہے، اور جن کے تبسم میں روح کی آزردگی رچی ہوئی ہے۔

اچھا، اب تم سناؤ، کیسے ہو۔۔۔۔؟کیا تم انسانی بھوتوں کے درمیان خوشی سے

جی رہے ہو۔۔۔۔؟وہ انسان نما عفریت، جنہیں تم ہر روز دیکھنے پر مجبور ہو۔۔۔۔!

جبران

☆☆☆☆☆☆

می زیادہ کا مکتوب جبران کے نام

قاہرہ (مصر) 12 مئی 1912ء

''ٹوٹے ہوئے پر'' کی ترسیل پر میرا ''شکریہ'' قبول فرمائیے۔

تم نے اس کتاب کے متعلق میری رائے پوچھی ہے تو جواباً گزارش ہے کہ میں کیا اور میری رائے کیا۔۔۔؟ تمہارے فن کے متعلق میری رائے کی کچھ اہمیت نہیں ہے۔ البتہ ایک پرخلوص دوست کی حیثیت میں اپنی رائے کا اظہار ضرور کروں گا۔ عزیزی جبران، میں تمہارے فن کی قدر دان ہوں اور تہہ دل سے تمہارا احترام کرتی ہوں، اس لئے کہ تم ایک دردمند، پرخلوص اور سچے فنکار ہو اور اپنے اصولوں کی تبلیغ میں دیانت دار ہو، لیکن شادی کے نظریئے پر میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ اب رہا آزادیٔ نسواں کا مسئلہ، تو اس ضمن میں مجھے تمہارے بنیادی نظریات سے پورا پورا اتفاق ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ عورت آزادی کی مستحق ہے اور اسے آزادی ضرور ملنی چاہئے۔ مرد کے دوش بدوش اسے بھی اپنے رفیق حیات کے انتخاب کی مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ شادی کے مسئلے میں عورت کی رضامندی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ عورت کو اپنے شریک حیات کا انتخاب خود کرنا چاہئے نہ کہ والدین اور عزیز واقارب کو۔۔۔ لیکن جب وہ اپنا شریک حیات چن لیتی ہے تو اس پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اس سے وفادار اور مخلص رہے اور زندگی کے کسی موڑ پر اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے اور اپنا دامن آلودگی سے بچائے رکھے! تم ان ذمہ داریوں کو زنجیروں سے تشبیہ دیتے ہو، تمہارے نزدیک یہ ذمہ داریاں ایک ناروا اور ظالمانہ پابندی کے سوا کچھ نہیں۔۔۔ لیکن یہ زنجیریں قدرت نے عورت کو خود پہنائی ہیں اور فطرت کے قوانین تمام قوانین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شادی شدہ عورت اپنے آشنا سے چوری چھپے ملاقاتیں کرتی ہے تو وہ صرف اپنے شوہر بلکہ اپنے خدا کو بھی دھوکا دیتی ہے اور میرے نزدیک ایسی بے وفا عورت

قابل تعزیر ہے اس کا یہ فعل معاشرے کی نظروں میں مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔

وقت نکاح، عورت وفا داری کا عہد کرتی ہے اور روحانی پیمان وفا بھی اتنا مقدس ہے جتنا کہ جسمانی۔۔۔۔وہ روحانی اور جسمانی، ہر دو صورتوں میں اپنے عہد کی پابندی ہے۔

ایک طرف تو وہ اپنے شوہر کی وفا داری کا بھرم بھرتی یہاور دوسری طرف اپنے محبوب کو بھی اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے۔ایسی صورت میں وہ نہ صرف اپنے شوہر کو بلکہ اپنے محبوب، خدا، معاشرے اور خود اپنے آپ کو بھی فریب دیتی ہے۔اپنے فرض، اپنے خاندان اور اپنے ضمیر کو دھوکا دیتی ہے۔تم کہتے ہو کہ فرض ایک مہمل لفظ ہے جس کے مطالب متعین نہیں کیے جا سکتے۔۔۔۔۔لیکن جب ہم خاندان کے لفظ کو سمجھ لیتے ہیں تو خاندانی فرائض کا مفہوم ہمارے ادارک سے ماورا نہیں رہ سکتا !ایک خاندان میں عورت جو کردار ادا کرتی ہے وہ بڑا ہی مشکل، بڑا ہی مستحسن مگر بڑا ہی تلخ ہوتا ہے۔

میں جانتی ہوں کہ آج کی عورت رسم و رواج اور خاندانی وقار کی ریشمی ڈوریوں میں جکڑی ہوئی ہے اور اپنی آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے لیکن اس آزادی کا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ وہ اپنے شریک حیات کی عزت کو مجروح کرتے ہوئے اپنے محبوب کی آغوش میں پڑی رہے۔ مثال کے طور پر تمہارے ناول کی ہیروئن "سلمٰی کرامی" ایک مظلوم عورت ہے جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کی گئی ہے اور اسی لئے وہ اپنے محبوب سے چھپ چھپ کر ملتی ہے کیا تم سلمٰی کرامی، ایسی عورت کو یہ جرات نہیں دلا سکتے کہ وہ اس شادی پر رضامندی کا اظہار نہ کرے، کیا تم اسے اپنے حق کے لئے لڑنا نہیں سکھا سکتے۔کیا یہ اقدام اس کی آئندہ زندگی کو خوشگوار نہیں بنا سکتا۔اس کے برعکس تم ایک شادی شدہ عورت کو گناہ کی ترغیب کیوں دیتے ہو۔۔۔گناہ سے میری مراد کوئی جسمانی گناہ نہیں۔ بلکہ بے وفائی کے گناہ

سے ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اگر وہ شوہر سے چھپ کر، اپنے محبوب کے ساتھ یسوع مسیح کے مقدس صلیب کو بھی بوسہ دیتی ہے تو میری نظروں میں وہ قابل تعزیر ہے۔۔۔۔!

اے تلخ نوائی پر معمول نہ کرنا، یہ تو اظہار محبت ہے۔ تمہاری دل شکنی کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی!

می زیادہ

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بنام می زیادہ

عزیزہ من ! می

''المجنون''(پاگل) میری شخصیت کا پرتو نہیں ہے یہ کردار جن خیالات اور نظریات کا اظہار کرتا ہے اسے میرے نظریات و خیالات کا نام نہیں دیا جا سکتا۔۔۔۔میرا یہ کردار جس لب ولہجہ میں بات کرتا ہے اور جس مخصوص طرز تخاطب و انداز تکلم سے کام لیتا ہے۔میرا اپنا لب ولہجہ اور انداز تکلم اس سے یکسر جدا گانہ ہے۔اگر تم میری اصلیت یا حقیقت کو پانے کی متلاشی ہو تو تم وادیوں اور پہاڑیوں کا رخ کیوں نہیں کرتیں اور نوجوان چرواہوں کی بے نوازی سے محفوظ کیوں نہیں ہوتیں۔میرے وطن کے بے نواز چرواہے میری شخصیت کے پرتو ہیں اور میری شناخت کے لیے تمہیں ان کا قرب حاصل کرنا چاہئے۔پاگل کی چیخ پکار میں مجھے تلاش کرنا عبث ہے اور یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی آگ کی لپٹوں میں شبنم کو تلاش کرے!

''پاگل'' کا کردار، ایک لمبے سلسلہ زنجیر کے درمیان اتصالی نوعیت کا سا ہے، یہ زنجیریں پختہ لوہے سے بنائی گئی ہیں لیکن پاگل کا کردار گویا خام لوہے کی زنجیر کے مشابہ ہے۔

ہر نفس کا اپنا ایک موسم ہوتا ہے می۔۔۔۔۔نفس کا زمستان، اس کی بہار کا نعم البدل نہیں ہوتا اور گرما کی تمازت سرما کی برودت کا جواب نہیں دیتی!

اب چند الفاظ ''اشک وتبسم'' کے متعلق بھی سن لو!اس مجموعے کی تمام تحریریں جنگ عظیم اول سے پہلے کی ہیں۔میں نے تمہیں اس کی ایک جلد بھیجی تھی۔لیکن پتا نہیں تم نے اس تبصرہ کیا ہے یا نہیں۔۔۔۔یہ تمام تحریریں آج سے سولہ برس پہلے ''المہاجر''میں چھپ چکی ہیں۔انہیں یک جا کرنے اور کتابی صورت میں شائع کروانے کا سہرا نسیب عریضہ۔۔۔۔کے سر ہے۔''اشک وتبسم'' سے پیشتر بھی میں نے بہت

کچھ لکھا ہے لیکن ان تحریروں کو چھپوا کر، میں اپنے آپ پر ظلم نہیں کر سکتا! میرے نزدیک وہ قابل اشاعت نہیں ہیں اور کسی بھی صورت میں مجھے متاثر نہیں کرتیں، لہذا ایسی تحریروں کو چھپوانا، اپنے اوپر ظلم کرنے کے مترادف ہی تو ہے۔

جبران

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بنام میخائیل نعیمی

(1)

نیویارک، 14 ستمبر 1919ء

عزیزی میخائیل!

السلام علیکم!

میں ایک طویل سفر کے بعد واپس آیا ہوں اور آتے وقت عزیزی نسیب سے بھی ملاقات ہوگئی ہے۔ ''الفنون'' کے متعلق اس سے خاصی مفید بحث ہوئی ہے۔ میں نے نسیب سے کہا تھا کہ وہ الفنون کی ادارت میں میری معاونت کرے لیکن اس ذمہ داری کو یوں قبول نہیں کرتا کہ تنہا ہے۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ تم نیویارک آجاؤ اور ہم تینوں مل کے اس جریدے کو مستحکم بنیادوں پر استوار کریں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مصر اور شام کے لوگ بھی ہماری آواز پر لبیک کہیں گے۔ اگر تم آجاتے ہو تو الفنون کی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔ نسیب عریضہ اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔

میری دعا ہے کہ تم نے آج تک جتنے سنہرے خواب دیکھے ہیں، خدا ان کے تعبیر تمہاری رضا کے مطابق لائے اور تم اپنی صلاحیتوں کا ثمر حاصل کرسکو!

تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام میخائیل نعیمی

(2)

بوسٹن 1920ء

براورم میخائیل!

السلام علیکم!

خدا تمہارے شفیق دل اور مقدس روح کو اپنی امان میں رکھے! میں اس وقت یہ جاننے کا آرزومند ہوں کہ تم کہاں اور کس حال میں ہو۔۔۔۔؟ کیا تم اس وقت اپنے خوابوں کے سبزہ زاروں میں ہو یا اپنے خیالات کے کوہ و بیاباں میں یا تم پہاڑ کی اس چوٹی پر کھڑے ہو جہاں پہنچ کے سارے خواب ایک منظر میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔۔۔۔اور تمام خیالات ایک، واحد جذبے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔۔۔؟بس میں یہی جاننا چاہتا ہوں۔۔۔؟ہاں بتاؤ تو اس وقت کہاں ہو۔۔۔؟

اور جہاں تک میرا تعلق ہے۔۔۔میں اس وقت اپنے برباد شدہ صحت اور دوسروں کی رضا کے درمیان پس رہا ہوں۔ میں ایک بے سرے ساز کی مثال ہوں اور یہ ساز ایک دیو کے ہاتھوں میں ہے اور اسے بجائے چلا جا رہا ہے اور اس امر سے بے خبر ہے کہ ساز سے پھوٹنے والی عنادو آہنگ سے عاری ہے! خدا مجھ پہ رحم کرے میشا، اور ہمیں ان امریکیوں سے محفوظ رکھے۔ خدا کرے کہ ہم دونوں اس جہنم سے نکل کے لبنان کی بہشت آفریں وادوں میں پہنچ جائیں!

آج ہی میں نے ''عبدالمسیح'' کو ایک تحریر بھیجی ہے۔ میرے بھائی، اسے بغور دیکھ لینا، اگر تو یہ تمہارے معیار پر پوری اترے تو اسے اپنے جریدے میں چھاپ دینا، ورنہ عبدالمسیح سے کہنا کہ میرے آنے تک اسے کسی تاریک گوشے میں محفوظ کہہ دے!

یہ نثر پارہ میں نے نصف شب کے بعد اور سحر سے پہلے لکھا ہے۔ اس لئے میں

یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی فنی حیثیت کیسی ہے لیکن مرکزی خیال تمہیں یقیناً متاثر کرے گا۔

نسیب ان دنوں کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ مجھے جب بھی تم دونوں کا خیال آتا ہے میری روح ایک تسکین سی محسوس کرتی ہے اور میں اپنے آپ کو ایک سحر آفریں سکوت میں لپٹا ہوا محسوس کرتا ہوں اور پھر اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ

''صحرائے ہستی میں کوئی سراب نہیں۔''

تم پر ہزاروں سلام، کہ تم حق و صداقت کے علم بردار ہو۔۔۔۔خدا تمہیں ہمیشہ اپنے حفظ و اماں میں رکھے! اور ہماری محبت کو ثبات بخشے! آمین

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام می زیادہ

(1)

یکم نومبر 1920ء

عزیز من، می!

ہر بار جب نفس آئینہ حیات میں جھانکتا ہے تو اسے اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔۔۔۔

اور ہر بار جب نفس سازِ حیات کو سننے کی کوشش کرتا ہے تو اسے اپنے نام کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔۔۔۔

اور جب بھی وہ زندگی میں کچھ تلاش کرنے کی جدوجہد کرتا ہے تو اپنے وجود کے سوا اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔۔۔۔

وہ بحرِ حیات میں غوطہ زن ہوتا ہے تو اس کی تہہ سے بھی اسے اپنی "خودی" کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

زندگی کا ہر تجربہ، اور ہر مشاہدہ، اس کے وجود کا ایک حصّہ ہے اور زندگی کا ہر راز اس کا اپنا راز ہے۔

گزشتہ سال کی بات ہے کہ میرے نفس نے ایک پرندے کو اسیر کیا کہ جس کا نام "راز" تھا۔ اس نے یہ پرندہ مجھے دکھایا کہ شناخت کروں۔ لیکن میں اسے نہ پہچان سکا۔۔۔۔میرا نفس بضد تھا کہ اس "راز" کو بہر حال منکشف ہونا چاہئے۔۔۔۔میں اس "طیر راز" کو اپنی ایک دوست کے پاس لے گیا کہ شاید وہ اس کی پہچان کرا سکے۔۔۔۔!

لیکن سنتی ہو می، اس نے کیا جواب دیا۔۔۔؟ اور پرندے کا کیا نام بتایا۔۔۔؟ اس نے کہا۔

"یہ کسی مدھر نغمے کی لے ہے۔"

اور یہ جواب ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں اپنے آغوش میں لٹائے ہوئے لختِ جگر کے متعلق کسی سے پوچھے کہ اس کی آغوش میں کیا ہے؟ تو جواب دینے والا یہ کہے:

"تمہاری گود میں تو لکڑی کا مجسمہ ہے!"

اب تم ہی کہو اپنی دوست کے جواب پر میرے احساسات پر کیا بیتی ہوگی! اس کا جواب اب تک میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا اور میرے قلب کو اپنے نوکیلے پنجوں سے نوچ رہا ہے۔

میں اس قدر مایوس ہوں کہ مجھ پر ہمہ وقت ایک سکوت سا طاری رہتا ہے۔ یاس بھرا سکوت۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو اور میں تمہارے رخِ پر نور پر نظریں جمائے مسلسل اور پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا چلا جاتا ہوں۔۔۔ تم خاموش ہو، چہرے پر حیا کی شفق پھیلی ہوئی ہے اور پلکوں کی ریشمی جھالریں جھکی ہوئی ہیں اور تمہارے نین کنول ان میں چھپ سے گئے ہیں۔ ہم اتنے قریب ہیں کہ تمہارے دل کی دھڑکنیں ایک ایک ضرب کے ساتھ میری میری سماعت میں اتر چلی جاتی ہیں۔۔۔ ہمارے درمیان خاموشی نغمہ سرا ہے۔ اور اس نغمے میں میری اور تمہاری محبت کی داستاں بسی ہوئی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ خاموشی کا بہترین اظہار ہے۔۔۔؟

اور جب مجھے پتہ چلتا ہے کہ یہ تو محض میرا تصور ہے تو دل پر ایک بار پھر افسردگی سی چھا جاتی ہے۔ لیکن امید زندگی کا سہارا ہے۔ ہر خزاں کے سینے میں بہار کا دل دھڑکتا ہے اور ہر شب کے سینے میں مسکراتی ہوئی صبح چھپی بیٹھی ہے۔ اور ہر نا امیدی کے پردے میں عروسِ امید لپٹی ہوئی ہے!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام می زیادہ

(2)

اپنے کسی مکتوب میں می زیادہ نے جبران سے پوچھا تھا کہ اس کی زندگی کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔۔۔؟ وہ کیسے لکھتا ہے؟ کھانے میں اسے کون کون سی اشیاء مرغوب ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ استفسار بھی کیا تھا کہ اس کا گھر کیسا ہے، دفتر کی کیا صورت ہے۔۔۔؟ ذیل کے خط میں جبران نے می کے انہی سوالات کے جواب دیئے ہیں۔۔۔!

1920ء

عزیزہ من، می!

کتنے شیریں ہیں تمہارے سوالات اور کتنا مسرور ہوں میں کہ تمہیں ان کے جوابات لکھنے چلا ہوں۔

''امروز من'' سگریٹ نوشی کا دن ہے۔ آج تک میں دس لاکھ سگریٹ پھونک چکا ہوں۔ سگریٹ نوشی میری عادت نہیں، میری تفریح ہے۔ یہ میرے لئے ذریعہ مسرت ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ایک ہفتے تک میں سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگاتا۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ میں آج تک دس لاکھ سگریٹ پھونک چکا ہوں تو اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے، صرف تم پر۔ اور تمہی میری سگریٹ نوشی کا بنیادی متحرک ہو۔۔۔۔! یہ قصور سراسر تمہارا ہے اور صرف تمہارا!

اور اگر قصور میرا ہوتا، یا خطاوار میں ہوتا تو یقین جانو کہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا!

میں ہمیشہ دو لباس بیک وقت پہنتا ہوں۔ آج بھی میرے وجود پر دو لباس ہیں۔ ایک تو عام لباس ہے، سوت سے بنا ہوا اور اخیال کا سلا ہوا لیکن دوسرا لباس گوشت، خون اور ہڈیوں سے بنا ہوا ہے۔

جہاں تک میرے دفتر کا تعلق ہے تو یہ آج بھی چھت اور دیواروں سے محروم ہے۔ لیکن ریت کے سمندر اور ایثر کے سمندر بھی ایک ہی سے ہیں۔ عمیق، متلاطم اور بے کراں۔۔۔۔

اور سفینہ ما کہ جس میں میں سوار ہوں، بادبانوں سے خاطر ہے کیا تم میری کشتی حیات کو بادبان عطا کر سکتی ہو؟

میں تمہیں اپنے متعلق کیا بتاؤں اور کیا بتاؤں! تم اس مرد کے بارے میں کچھ جان کے کیا کرو گی کہ جو دو عورتوں کی محبت میں اسیر کر دیا گیا ہو؟ اور عورت نے اسے

خواب سے جگا کے بیداری سے آشنا کیا ہے اور دوسری نے اسے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا ہے ۔۔۔۔اس مرد کے بارے میں کیا سنو گی، جسے خدا نے دو شمعوں کے درمیان ایستادہ کر دیا ہو؟ کیا کہوں؟ وہ مسرور ہے کہ مخزوں؟ کیا وہ اس دنیا کے لئے اجنبی ہے ۔۔۔؟ میں کچھ نہیں جانتا ۔۔۔۔!

کیا تم چاہتی ہو کہ یہ شخص ہمیشہ اجنبی بنا رہے، اور کوئی اس کی زبان نہ سمجھے ! کہ وہ زبان ہی ایسی بولتا ہے جو ہر کسی کی سمجھ سے ماورا ہے !

لیکن اس شخص کو صرف تم جانتی ہو ۔۔۔اس کی زبان کو صرف تمہی سمجھتی ہو ۔۔۔اس دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جو میری روح کی زبان کو سمجھنے سے قاصر ہیں ۔۔۔اور اسی طرح کتنے ہی لوگ ہیں جو تمہاری روح کی زبان نہیں سمجھتے ۔۔۔! لیکن مجھے تمہاری پوری ہستی اور تمہارے ورے وجود کا ادارک ہے ۔ میں تمہاری زبان کا ایک ایک لفظ سمجھتا ہوں !

کہنے کو تو زندگی نے مجھے اور تمہیں ایک نہیں، بہت سے دوست عطا کر رکھے ہیں لیکن ان سب میں ایسا کون ہے جس سے ہم یہ کہہ سکیں ۔"رفیق من ! صرف آج کے روز، میری صلیب تم اٹھا لو !۔۔۔" اور وہ اٹھالے ۔۔۔! کون ہے ایسا دوست؟ اور ایسا رفیق؟ کون ہے جسے ہماری مسرتوں میں غم کی پرچھائیاں اور غموں میں مسرت کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہوں ۔۔۔؟

اور کیا کہوں، می ! تم تو میرے متعلق اتنا کچھ جانتی ہو کہ شاید خود میں بھی نہیں جانتا !

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام میخائیل نعیمی

(3)

بوسٹن 1921ء

برادرم میشا!

''الرابطہ'' کا آخری نمبر پڑھنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا ہے کہ جیسے ہمارے اور ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہے اور ہم ایک دوسرے کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔سنو میشا، ادب کی دنیا میں سطحی الفاظ کا دوردورہ ہے اور ہم انہیں اس ادبی غلامی سے آزاد نہیں کرا سکتے! روحانی آزادی انسان کے اندر سے جنم لیتی ہے باہر سے وارد نہیں ہوتی اور اس کے متعلق تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔۔۔۔!

میری مانو تو ان ذہنوں کو بیدار کرنے کی کوشش ترک کر دو، جنہیں قدرت نے کسی مخفی دانش کے حصول کے لئے نیند کی آغوش میں لٹا دیا ہے! تم ان کے لئے خواہ کچھ بھی سوچو، انہیں جو چاہے بھیجتے رہو، لیکن میری اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ تمہارا ہر اقدام ''الرابطہ'' کے چہرے پر شکوک کی نقاب ڈال دے گا۔

سو تم دیوانگی کے ساحل تک آ پہنچے ہو۔۔۔۔؟ بڑی دل خوش کن خبر ہے۔اس بے باکی میں کتنی شاہانہ عظمت ہے۔۔۔۔! اور اس عظمت وحسن میں کیسا خوف پنہاں ہے۔۔۔۔! دیوانگی بے نیازی کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم ہے! اگر یہ بات ہے تو دوانے ہو جاؤ میشا! کہ دیوانگی سعادت ہے اور ہر کسی کو نہیں ملتی! پاگل ہو جاؤ اور ہمیں بتانا کہ دیوانگی کے اس پار ''کیا'' ہے؟ اسرار حیات کو صرف پاگل ہی سمجھ سکتے ہیں۔لہٰذا میری دعا ہے کہ سدا دیوانے رہو اور اپنے اس دیوانے بھائی کے قریب رہو! اس کے حبیب رہو!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام میخائیل نعیمی

(4)

بوسٹن 1921ء

عزیز میشا!

تمہارے اس دل پر ہزاروں سلام کہ جو دھڑکنا جانتا ہے نہ پھڑکنا! جو ہر جذبے سے عاری ہے۔۔۔۔!

مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے تم میرا تمسخر اڑا رہے ہو کہ جبران تمہارے بال تو سفید ہو گئے ہیں لیکن تمہاری شاعری ابھی تک "سیاہ" ہے! تم مجھے الزام دیتے ہو کہ میں بہت ہی مختصر نویس ہوں۔۔۔اور اپنے متعلق ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ تم آہستہ آہستہ میری سمت بڑھ رہے ہو۔ وشنام طرازی کرتے ہوئے، اور میرے قریب آنے کے لئے تم نے دروازہ بھی کون سا چنا ہے باب التکفیر! اعوذ باللہ من الکفر۔!

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے تو تم میں کوئی نقص اور کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا! اپنے سیاہ بالوں کے ساتھ تم اپنی ذات میں ہنوز مکمل ہو! اپنی نثر و نظم کے ساتھ ہنوز نوجوان ہو۔۔۔! مجھے یوں لگتا ہے کہ تم اپنی حسب آرزو خلق ہوئے ہو۔ اور یہ آرزو اور یہ رضا تم میں اسی وقت پیدا ہو گئی تھی کہ جب تم محض جنین میں تھے۔۔۔اور تم نے اپنی خواہشات کی تکمیل جھولے ہی میں کر لی تھی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی ہے کہ نسیب نے تمہیں الرابطہ کے مجموعے کا تعارف لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ تم لکھ رہے ہو، یا لکھ چکے ہو، تو بھی اتنا خیال رہے کہ گردن میں ہار ہی ڈالے جاتے ہیں اور کلائیوں میں کنگن ہی پہنائے جاتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ تم ادب کے تاج میں کوہ نور کی طرح رہو، اور آسمان ادب پر کہکشاں بن کے تابندہ و درخشندہ رہو!

میری صحت گزشتہ ہفتے کی نسبت بہتر ہے لیکن یہ پابندی عائد ہے کہ تین ماہ تک لکھنے، پڑھنے حتیٰ کہ سوچنے تک سے پرہیز لازمی ہے! تم تو جانتے ہی ہو بیٹا کہ بیکار رہنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ جو شخص لکھنے پڑھنے کا عادی ہو، اس کے لئے نہ لکھنے کی پابندی تعزیر عظیم ہے!

خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہماری محبت کو ثبات بخشے! آمین!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام میخائیل نعیمی

(5)

بوسٹن 1921ء

براد رم میشا!

جب سے میں اس شہر میں دوبارہ وارد ہوا ہوں ایک سے ایک خصوصی معالج کی پیچھے سرگرداں ہوں۔۔۔۔ہر معائنہ، پہلے معائنے سے زیادہ نقاہت انگیز ہے۔ ہر ڈاکٹر یہی کہتا ہے کہ تمہارے دل کی دھڑکن بے قاعدہ اور بے آہنگ ہے۔ اس کی ضربوں میں رابطہ نہیں۔۔۔۔اور تم تو واقف ہی ہو میشا میرا دل، دوسرے دلوں سے کتنا بہت سا مختلف ہے۔ یہ نظم و آہنگ کا پابند نہیں ہے۔ رابطہ و ضبط سے اسے کوئی لگاؤ نہیں! یہ تو صرف میرا ساتھ دینا جانتا ہے۔ اسے میری رفاقت پر ناز ہے۔ یہ سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور یہ جو گوشت کا لوتھڑا میرے سینے میں بند ہے، میں تو اسے دل سمجھتا ہی نہیں ہوں۔ یہ تو کوئی اور شے ہے۔۔۔۔یہ تو ایک دھند ہے۔ کہرا ہے اور اس کہرے کا نام ہے ''انا!''

میرے متعلق فکرمند نہ ہوا کرو میشا، میری تقدیر کے بارے میں نہ سوچا کرو! میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ طلوع سحر سے پہلے میں اس کوہ کی ڈھلوان سے نہیں گرنے کا اور صبح۔۔۔۔وہ تو ہر شے پر اجالے کی چادر پھیلا دیتی ہے اور ہر چیز کو جگمگا دیتی ہے۔۔۔۔!

نیو یارک سے روانہ ہوتے وقت میں نے کوئی شے اپنے ساتھ نہیں لی۔۔۔۔سوائے ''النبی'' کے مسودے کے۔۔۔۔! میرا خیال تھا کہ میں اسے چھپوا کر ہی لوٹتا لیکن بیماری اتنی مہلت نہیں دی۔۔۔۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کب تک نیو یارک لوٹو گا۔۔۔۔اس لئے ڈاکٹر نے سفر پر پابندی لگا دی ہے۔ ان کا حکم ہے کہ صحت مند ہوئے بغیر میں کسی جگہ نہیں

جاسکتا! اس علامت نے میرے تمام پروگرام تلپٹ کر دیئے ہیں اور میں خود اپنے وجود میں اسیر ہو کے رہ گیا ہوں۔

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام میخائیل نعیمی

(6)

بوسٹن 1922ء

برادرم میشا!

"صبا" کی موت نے مجھے بری طرح متاثر کیا ہے۔لیکن سچ پوچھو تو جیسا وہ ہم سے سبقت لے گیا ہے اس نے اپنی منزل پالی ہے اوا پنی مرادکو پہنچ گیا ہے۔اور ہم ہنوز دامن پھیلائے کھڑے ہیں۔موت کی خواہش مجھے اس سے زیادہ تھی،اور میں اس سے پہلے موت سے ہم آغوش ہونے کا آرزومند تھا لیکن وہ مجھ سے خوش نصیب نکلا،موت اس پر مہربان ہوگئی اس کے لئے اپنی شفقت بھری آغوش وا کردی!

میں موت کی حقیقت جانتا ہوں۔۔۔۔لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں صبا کی موت پر اشک بار ہوں۔میرے دل میں غم کی آگ دہکنے لگی ہے اوراس آگ کو صرف موت ہی سرد کر سکے گی!

صبا دل میں بھی بہت سی حسرتیں دفن ہوں گی،اس کی روح میں کئی امیدیں پنہاں ہوں گی اور ذہن میں کئی خواب ہوں گے۔۔۔۔اور وہ ان سب کی تکمیل وتعبیر کا خواہش مند بھی ہوگا لیکن موت ہر امید پر غالب پہ گراں ہے! مجھے تسلیم ہے کہ وہ اپنی امیدوں اور آرزوؤں کے شگوفوں کو دیکھنے کے متمنی ہوگا اور وہ اس کی تمنا ہوگی کہ اپنے خوابوں کو ثمر بار دیکھے۔۔۔۔للیکن موت،امید کے شگوفوں سے حسین تر اور خوابوں کے اثمار سے شیریں تر ہے!

ڈاکٹروں کا اصرار ہے کہ مجھے ابھی نیویارک نہیں جانا چاہئے،تا نکہ میرا دل ربط و ضبط کا عادی نہ ہو جائے!اور ہاں،ڈاکٹر حضرات کا مشورہ ہے کہ مجھے شہر سے دور رہنا چاہئے۔۔۔۔اسی لئے میں نے سوچا کہ مریانہ کو ساتھ لے کر سمندر کے کنارے

جابسوں!

بیٹا! آج کی باطل تہذیب نے ہماری روحوں کے تار اس قدر کس دیئے ہیں کہ اب وہ شکستہ ہونے ہی کو ہیں۔۔۔۔اس سے پہلے یہ جھوٹی تہذیب ہماری روحوں کے تار شکستہ کر دے ہمیں اسے خیر باد کہہ دینا چاہئے۔۔۔۔! لیکن صبر ضروری ہے تا آں کہ وقت رخصت نہیں آجاتا!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام میخائیل نعیمی

(7)

بوسٹن 1922ء

براد رم میشا!

شام بخیر کے لیے ایک خوش خبری لے کر آیا ہوں کہ نسیب اب کہیں نہیں جانے کا۔۔۔وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا! اس کا ارجنٹائن کا سفر اب قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔

ہمارے لئے باعث مسرت ہے کہ تم جمعرات کو واپس آرہے ہو۔ پیارے میشا، بہت دن لگا دیئے تم نے! تمہاری غیر حاضری میں الرابطہ میں کوئی رونق نہیں تھی اور کوئی کشش نہیں رہی تھی۔

مجھے تمہاری اس بات پر کوئی مسرت نہیں ہوئی کہ ''عزرائیل، میخائیل کا خاتمہ دے''۔۔۔میرے خیال میں میخائیل، عزرائیل سے زیادہ طاقت ور ہے اور عزرائیل پر فوقیت رکھتا ہے۔۔۔ادوسرے کو پہلے پر برتری حاصل نہیں۔ بعض ناموں کے معنی ہمارے فہم وادراک سے زیادہ عمیق ہوتے ہیں اور ان کی رمزیت ہماری سوچ سے کہیں پیچیدہ ہوتی ہے۔۔۔!

خدا کرے تم سے جلد ملاقات ہو، آمین!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام میخائیل نعیمی

بوسٹن 1922ء

برادر من! السلام علیکم!

ارادہ کر رہا تھا کہ اس سال مصر اور لبنان جاؤں گا لیکن میری مسلسل اور اذیت ناک علالت نے میرے تمام ارادے التواء کی نذر کر دیئے ہیں اور جن دستوں اور رفیقوں سے ملاقات کی تمنا تھی، ان سے آئندہ دو سال تک ملاقات کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا! اس اثناء میں میری انگریزی تصنیف ''النبی'' The Prophet بھی شائع ہو جائے گی علاوہ ازیں تم سے کیے گئے وعدے کے مطابق چند تصویریں مکمل کر رہا ہوں، امید ہے میرا عزم مجھے ندامت کے دروازے تک نہیں پہنچنے دے گا!

میں لبنان کے لئے ترس گیا ہوں۔ جوں جوں مرض شدت اختیار کرتا ہے۔ وطن کی محبت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ گویہ بھی ایک روگ ہی ہے لیکن میرے نزدیک مبارک اور سعید ہیں وہ لوگ جن کے دل وطن کی محبت میں علیل ہو گئے ہیں۔۔۔۔میرا بس چلے تو اسی وقت اپنے گھر پہنچ جاؤں اور اپنے گھر کے در و دیوار سے گلے مل کے روؤں کے افسردگی کا زہر اشکوں کے راستے روح سے نکل جاتا ہے! لبنان ہمارے لئے جنت ارضی ہے!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام ایڈمنڈ وہبی

نیویارک،12مارچ1925ء

درمن! السلام علیکم!

اس کرم نوازی کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا۔آپ کے مکتوب نے مجھ پر راز منکشف کر دیا ہے کہ آپ علم وادب کے شیدائی اور فنی حسن ورعنائی کے پرستار ہیں۔فن اور فنکاروں کے لئے آپ کے دل میں تکریم بھرے جذبات ہیں۔

کاش میں اس تعریف وتوصیف اور تعظیم وتکریم کا مستحق ہوتا جو آپ نے اپنے خط میں مجھے بخشی ہے۔میری تمنا ہے کہ آپ کی اپنی فنی توقعات پر پورا اتر سکوں جو آپ نے ازراہ کرم میری ذات سے وابستہ کر رکھی ہیں! آپ نے میری تحریر ''مصلوب'' The Crucified کا فرانسیسی زبان میں جو ترجمہ کیا ہے،وہ مجھے بے حد پسند آیا۔

مجھے اپنے لبنانی اور شامی وطنوں پر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل روحانی احساسات سے عاری ہیں۔ ہمارے نوجوان اپنی مادری زبان سے تغافل برتتے ہوئے غیر ملکی زبانیں سیکھ رہے ہیں آپ تو جانتے ہیں نا کہ ہماری مادری زبان یعنی عربی،ہر لحاظ سے ترتر واعلیٰ ہے۔فصاحت وبلاغت میں کوئی زبان اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتی!

ہم عربی مہاجرین کی ادبی انجمن ''الرابطہ'' کے متعلق آپ کے جذبات قابل قدر اور قابل تعریف ہیں۔ میں اپنے تمام احباب کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔۔۔۔

میرے پرخلوص دوست اور عظیم ادیب فلیکس فارس سے میرا سلام کہہ دیجیے گا!

جبران

☆☆☆☆☆☆

می زیادہ بنام خلیل جبران

قاہرہ (مصر) 1925ء

رفیق من!

میرے قلب ونفس پر ایک عجیب سی بے خودی طاری ہے اور میں نہیں جانتی کہ میں کیا کر رہی ہوں؟۔۔۔لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ ۔۔۔بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے اور اس محبت نے میری زندگی کو نئے معنی پہنا دیئے ہیں اور اسے ایک نیا مفہوم بخشا ہے۔۔۔۔یہ محبت دبے پاؤں میرے دل میں در آئی ہے اور آتے ہی میری زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا ہے، طلوع سحر، غروب آفتاب اور چاندنی رات اور دودھیا کہکشاں۔۔۔سبھی میری محبت کے حسین مظاہر ہیں۔

میں نے محبت سے زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لی ہیں۔اور اسی لئے خائف ہوں کہ میری یہ توقعات، یہ تمنائیں اور یہ آرزوئیں تکمیل کی آغوش تک نہیں پہنچنے پائیں گی! مجھے اپنی محبت کا انجام صاف دکھائی دے رہا ہے۔۔۔۔لیکن مجھے انجام کی پرواہ نہیں کہ میں اسے بدل دینے پر قادر نہیں ہوں۔میں آغاز اور انجام، دونوں کی مفتوح ومغلوب ہوں! دونوں نے مل کے مجھے شکار کیا ہے۔مجھے آغاز سے گلا ہے نہ انجام سے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کس بے حجابی اور تذبذب کے بغیر میں تمہیں اس قسم کی باتیں لکھ رہی ہوں۔یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ صرف خط میں لکھ رہی ہوں۔تمہارے سامنے بیٹھ کے نہیں کہہ رہی۔اگر تم اس وقت میرے سامنے موجود ہوتے تو میں ایسی باتیں شاید کبھی نہ کہتی۔اور اگر کہہ بھی دیتی تو اس وقت بھاگ جاتی اور پھر تا حیات تمہیں اپنی صورت نہ دکھاتی۔۔۔۔،اور جب تک تم یہ اقرار نہ کر لیتے کہ میری کوئی بات تمہیں یاد نہیں رہی تو تمہارے سامنے نہ آتی! میں اپنی اس بے باکی اور بے حجابی

اور جرات کے لئے شرمسار ہوں۔۔۔۔اور نہیں جانتی کہ یہ باتیں روا ہیں یا نہیں۔۔۔۔میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرا دل تمہارے ساتھ ہے اور زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارے ساتھ ہی دھڑکے گا۔ اس کی دھڑکنیں، تمہاری دھڑکنوں سے مشروط ہیں اور یہ دل ہی تو ہے جو مجھے محبت کے معبد میں لے آیا ہے اور مجھے ہمیشہ کے لئے اس میں مقید کر گیا ہے۔ باہر نکلنا چاہوں تو ہر دروازہ بند ہے۔ ہر باب مقفل ہے اور ہر راستہ مسدود ہے!

می زیادہ

☆☆☆☆☆☆

بنام می زیادہ

(1)

نیویارک1925ء

عزیزتی می!

میں اپنی زندگی کے نشیب وفراز کے متعلق کیا بتاؤں؟ دو ایک سال پیشتر مجھے کسی قدرتی تنہائی اور سکون میسر تھا لیکن اب یہ سکون، خاموشی اور خلوت بے ہنگم شوروغل میں تحلیل ہو چکا ہے اور تنہائی ایک لامتناہی جدوجہد میں بدل چکی ہے۔لوگ میرے شب وروز کے مالک بن گئے ہیں۔اوران کے مطالبات ہرروز بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ان سے نجات پانے کی آرزو میں میں شہر سے مضافات کی طرف بھاگنے کو کوشش کرتا ہوں۔امریکی بڑے جفاکش اور طاقتور ہیں۔یہ تکان کے مفہوم سے آشنا تک نہیں۔انہیں سونے کی عادت ہے نہ خواب دیکھنے کی اگر یہ کسی کو ناپسند کرنے لگیں تو اسے تغافل کی موت ماردیتے ہیں اور جسے پسند کرلیں،تو اس کا ناک میں دم کردیتے ہیں۔

شاید کسی روز وہ ساعت بھی آپہنچے کہ میں یہاں سے فرار ہو کے لبنان چلا جاؤں۔ جب بھی مجھے اپنے وطن کی یاد آتی ہے،میرا دل پگھلنے لگتا ہے اور روح مضطرب ہونے لگتی ہے۔

اور تم چاہتی ہو کہ میں ہردم تبسم اور شاداں وفرحاں رہا کروں اور ہر کسی کو معاف کردیا کروں۔جہاں تک مسکرانے کا تعلق ہے تو میں ازل سے ابد تک مسکراتا رہوں گا، میرے لبوں سے تبسم کی شفق کبھی محو نہیں ہوگی،لیکن عفو اور معافی بہت ہیبت ناک الفاظ ہیں۔جو معافی چاہنے سے پہلے اسے اپنی انا اور اپنی خودی کوندامت کی قربان گاہ پر ذبح کرنا پڑتا ہے اور جب انا اور خودی قربان ہو جاتی ہے تو آدمی معنوی موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے!میں اپنی ذات میں تنہا ہوں،اپنا مجرم خود ہوں۔میں نے

اپنے اوپر خود ہی ظلم کیا ہے اور یہ تنہائی میری اپنی طلب کا صلہ ہے۔ میں غلطی پر تھا، اور اب بھی غلطی پر ہوں۔ لہٰذا تم سے گزارش کروں گا کہ میری خطاؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے مجھے معاف کر دو! میں نے اپنی نا تم پر قربان کر دی ہے اور ندامت کے زنداں میں اسیر ہو گیا ہوں!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام می زیادہ کے نام

(2)

1926ء

رفیقۂ من!

تم مجھے شاعر اور مصور سمجھتی ہو۔ حالانکہ میں شاعر ہوں اور نہ مصور۔ یہ درست ہے کہ شب و روز میرا شغل لکھنا اور تصویریں بنانا ہے لیکن میرے شب و روز فن کے اسیر نہیں ہیں۔

میں ایک بادل ہوں رفیقۂ من! ایک ایسا بادل جو دوسری اشیاء میں سے گزرتا تو ضرور ہے لیکن ان کے باوجود میں اپنی ہستی کو گم نہیں کر دیتا! مجھے تم بادل ہی سمجھو کہ اسی میں میری تنہائی اور خاموشی اور اسی میں میری تشنگی اور گرسنی ہے۔ میں بالکل بادل ہی کی طرح ہوں اور مدت سے گوش بر آواز ہوں کہ کب کوئی مجھے یہ کہے کہ تم اس کائنات میں تنہا نہیں ہو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں ہم دو ہیں۔ اور اس طرح ایک ہو گئے ہیں جیسے (2) کا ہندسہ۔ کہ جو ایک ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک + ایک کے معنی لئے ہوئے ہے۔۔۔! اور وہ آواز مجھ سے یہ کہے کہ میں تمہیں جانتی ہوں۔۔۔ تمہاری اصلیت اور حقیقت سے آگاہ ہوں۔۔۔!

مجھے بتاؤ تو سہی می، کیا اس دنیا میں کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو مجھ سے یہ کہنے پہ قادر ہو۔ اے بادل، تم اکیلے نہیں ہو، ایک بادل میں بھی ہوں اور مجھے تمہاری رفاقت مقصود ہے۔۔۔! آؤ کہ ہم ایک ہو جائیں۔ وادیوں اور چٹانوں پہ چھا جائیں! بلند و بالا درختوں کی شاخوں سے کھیلتے ہوئے گزر جائیں، فلک بوس چوٹیوں کے لب چومیں اور ہواؤں کے ساتھ ساتھ جھومیں اور انسانوں کے پژمردہ دلوں کو مسرت و شگفتگی سے ہمکنار کریں۔

آؤ کہ ان دیکھی اور ان جانی نہایتوں کی سمت پرواز کر جائیں۔۔۔"سچ بتاؤ می

،ایسا کون ہے۔ جو میری رفاقت کا طلب گار ہو؟ جو میری خلوت کے تاریک گوشوں کو اپنے محبت بھرے وجود کے ساتھ منور کر دے۔۔۔۔ جو میری تنہائی کے زہر کو امرت بنا دے اور عشق کے ویران معبد میں میرے ساتھ سجدہ ریز ہونے پر رضامند ہو؟

جبران

☆☆☆☆☆☆

می زیادہ کے نام

(3)

1928ء

عزیزہ من!

اپنے یوم پیدائش سے لے کر اب تک میری ہستی عورتوں کی مرہون منت ہے۔ میری ''خودی'' پر ست سب زیادہ احسان عورتوں کی محبت وشفقت کا ہے۔عورتوں ہی نے میری آنکھوں کے پٹ کھولے اور میری روح کے باب واکئے۔عورت ہر حیثیت سے میری رفیق رہی ہے۔ماں کے روپ میں، بہن کے روپ میں اور دوست کے روپ میں!

سچ پوچھو تو می بیمار رہنے میں مجھے ایک لطف سا محسوس ہونے لگا ہے۔اب میں اپنی علالت سے بےزار نہیں ہوں بلکہ مجھے اس سے ایک لگاؤ سا ہو گیا ہے۔یہ لطف اور یہ لگاؤ۔۔۔ہر لطف اور ہر مسرت سے جداگانہ ہے۔۔۔بیمار آدمی اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہوتا ہے کہ زندگی کے بے ہنگم شوروشغب سے محفوظ رہتا ہے۔۔۔اپنوں اوت بیگانوں کے مبالبات سے اس کی جان بچی رہتی ہے۔ لوگوں کی بک بک اور ٹیلی فون کی جھک جھک سے ان کے کان نجات پا لیتے ہیں۔اپنی بیماری کے دوران مجھے ایک اور فائدہ پہنچا ہے۔ایک اور مسرت حاصل ہوئی ہے اور وہ یہ کہ تندرستی کے برعکس بیماری نے مجھے ایشائے مطلق کے بہت قریب کر دیا ہے۔بستر علالت پر لیٹے لیٹے جب میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں ایک پرندے میں تبدیل ہو چکا ہوں اور سرسبز وادیوں اور ہرے بھرے جنگلات کے اوپر محو پرواز ہوں۔میں اپنے آپ کو ان ہستیوں کے انتہائی قریب پاتا ہوں کہ جن کے دلوں میں میری محبت کی قندیلیں روشن ہیں!

کاش میں ان دنوں مصر میں ہوتا کہ میری تیمارداری وہ شخصیت کرتی جسے میں قلب

وروح کی پوری قوت سے پیار کرتا ہوں۔۔۔۔تمہیں پتا ہے می؟ کہ ہر روز صبح وشام میں خود کو قاہرہ میں تمہارے روبرو پاتا ہوں اور تم میری کتاب کا آخری باب پڑھ رہی ہوتی ہو۔۔۔۔وہ باب جو ابھی شرمندہ اشاعت نہیں ہوا۔۔۔۔!

جب میں اپنی موت کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے رگ وپے میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے اور مجھے ایک بے پایاں فرحت محسوس ہوتی ہے۔یقین مانو می کہ میں موت سے ہم آغوش ہونے کا تہہ دل سے آرزومند ہوں۔موت کی تمنا مجھے ہر لحظہ مضطرب رکھتی ہے! لیکن اس دنیا سے روانہ ہونے سے پہلے میں ایک لفظ، ہاں صرف ایک "لفظ" کہنا چاہتا ہوں۔یہ لفظ تا حال شرمندہ تکلم نہیں ہوا۔۔۔۔میں جب بھی اسے ادا کرنے کی سعی کرتا ہوں۔میری آنکھوں کے سامنے ایک دھندسی چھا جاتی ہے اور مجھے اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور میں طاقت گویائی پر قادر نہیں رہتا!

مجھے یقین ہے کہ میری یہ علامت میری مستقل رفاقت پر مصر ہے اور خود میں بھی اب اسے اپنے آپ سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔۔۔۔! ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔۔۔اور موت کے سوا کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کرسکتی! یہ بیماری تمہاری رقیب بن گئی ہے۔می! ہے نا عجیب سی بات!

جبران

☆☆☆☆☆☆

می زیادہ کے نام

(4)

رفیقۂ من!

بہت سے مسائل ہیں جنہیں میں تمہاری رفاقت میں زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں۔ اسرار کی بہت سی گتھیاں ہیں، جنہیں میں تمہاری مدد سے سلجھانا چاہتا ہوں۔ یہ مسائل کیا ہیں؟ اور اسرار کی یہ گتھیاں کیسی ہیں؟ یہ میں اسی وقت بتاؤں گا جب تم میرے پاس ہوگی۔ البتہ اتنا جان لو کہ ان کا تعلق ''بینات'' اور ''غیر بینات'' سے ہے! میں ان کے متعلق مہر بہ لب رہوں گا تا آں کہ بادل منتشر نہیں ہو جاتے اور باب الدھر نہیں کر دیئے جاتے۔ اس وقت سروش یزداں مجھ سے کہے گا۔۔۔''بولو! کہ اذن گویائی عام کر دیا گیا ہے اور ایام سکوت جا چکے ہیں! قدم اٹھاؤ کہ تم کب سے تذبذب کے سائے تلے کھڑے ہو۔۔۔!'' جانے بادل کب منتشر ہوں گے اور وقت کے دروازے کب کھولے جائیں گے!!!

ہم مینار رفعت پہ پہنچ چکے ہیں۔۔۔میدان، وادیاں اور جنگلات ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلتے چلے گئے ہیں۔۔۔اب ہمیں سستالینا چاہئے اور گویائی کو اذن دینا چاہیے، کہ ہمارا قیام نہایت مختصر ہے۔ ہمارے سامنے ایک اور چوٹی ایستادہ ہے اور غروب آفتاب سے پہلے پہلے ہمیں وہاں پہنچنا ہے۔۔۔ہم نے کوہستانی پگڈنڈیاں طے کر لی ہیں اور ہماری روحوں پر اضطراب کے سائے مسلط ہیں۔۔۔مجھے اعتراف ہے کہ میں بہت عجلت میں تھا اور عجلت دانش وحکمت کی دشمن ہے! میں ہمہ وقت دانش وحکمت کا رفیق نہیں ہوتا۔ لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ زندگی میں کچھ منازل ایسی بھی ہیں جو دانش وحکمت کی رسائی سے ماوراء ہیں؟ اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ زندگی میں ایک شے ایسی بھی ہے جو دانش وحکمت کو بھی مسحور ومبہوت کر دیتی ہے۔۔۔! انتظار، وقت کے پاؤں کی مثال ہے! اور میں ''نا

معلوم'' کے لئے ہمہ وقت منتظر رہتا ہوں!

بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اس شے کے وقوع کا منتظر ہوں جو تا حال وقوع پذیر نہیں ہوئی! میری مثال اس ناتواں کی سی ہے جو جھیل کے کنارے بیٹھا فرشتے کا انتظار کر رہا ہوں کہ وہ آئے اور جھیل کے خاموش پانی کو تموج آشنا کر دے! اب کہ فرشتہ آ چکا، اور جھیل میں تموج پیدا ہو چکا ہے، کون ہے جو مجھے اٹھا کے متلاطم جھیل میں پھینک دے؟ کوئی نہیں ۔۔۔؟ ہاں کوئی نہیں ۔۔۔؟ اچھا تو پھر کیا ہوا، میں خود ہی اس سحر زدہ اور مہیب مقام تک چلا جاؤں گا۔۔۔ میری آنکھیں عزم سے روشن ہیں اور میرے پاؤں ارادے کے ساتھ مستحکم ہیں!!!

جبران

☆☆☆☆☆☆

بنام می زیادہ

(5)

1930ء

عزیزہ من، می!

میری صحت گزشتہ ایام کے مقابلے میں زیادہ بدتر ہوگئی ہے۔ وہ وقت کے جو میں نے شہر اور سمندر کے درمیان گزارا ہے۔ اس نے میرے جسم اور روح کے درمیان ایک وسیع و عریض خلیج سی حائل کر دی ہے۔ میرا دل وحشی کہ ایک منٹ میں ایک سو بار دھڑکنا جس کا معمول بن چکا تھا میری صحت و توانائی کو برباد کرنے کے بعد اپنی طبعی رفتار میں واپس آ چکا ہے! بے شک آرام بہت ضروری ہے۔ لیکن ڈاکٹروں کے نزدیک آرام کے بجائے علاج زیادہ بہتر ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ادویات میرے مرض میں اس طرح اضافہ کر رہی ہیں جس طرح تیل، دیئے کی لو کو تیز کر دیتا ہے۔ مجھے اب ڈاکٹروں کی ضرورت ہے نہ ان کی ادویات کی۔ پرہیز کی ضرورت ہے نہ آرام کی۔ مجھے تو اب ایک ایسے مسیحا کی احتیاج ہے جو میری روح کو علالت کی زنجیروں سے آزاد کرا دے! مجھے روحانی دوا کی ضرورت ہے۔ ایک مددگار رفیق کی احتیاج ہے۔ جو میرے درماندہ نفس کو پھر سے تروتازہ کر دے۔۔۔ میں ایسی تند و تیز آندھی کا آرزومند ہوں جو میرے برگ و بار کو بکھیر کر رکھ دے!

میں ایک چھوٹا سا آتش فشاں ہوں، میں، ایسا آتش فشاں ہ جس کے دھانے کو بند کر دیا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے لکھنے کی اجازت دی جائے تو میرے قلم سے تخلیق کے ایسے پیکر جنم لیں گے کہ انہیں دیکھتے ہی میری علالت کے آسیب مجھے آزاد کر دیں گے۔۔۔ اگر مجھے چیخنے چلانے کی اجازت ہو تو میری چیخ پکار مجھے بیماری کی آغوش سے چھین لائے!۔۔۔ اب تم کہو گی کہ اگر یہ سچ ہے تو میں اپنی

صحت وتوانائی کی واپسی کے لئے قلم سے کیوں کام نہیں لیتا اور صحت کے لئے چیخ پکار اتنی ہی ضروری ہے تو میں چیخ پکار سے کیوں گریزاں ہوں۔۔۔۔؟ یقین جانو می، میرے پاس کوئی جواب نہیں۔۔۔۔

میں چیخنے چلانے پر قادر نہیں ہوں اور یہی میری علالت ہے۔۔۔۔ یہ ایک روحانی عارضہ ہے جس کی علامات جسم سے پھوٹ رہی ہیں۔۔۔۔!

تم کہو گی کہ پھر تم اپنے اس عارضے کا علاج کیوں نہیں کرواتے، اس بیماری سے نجات کیوں نہیں حاصل کر لیتے۔۔۔۔؟ کب تک یوں ہی بستر مرگ پر پڑے رہو گے اور آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟

سنو می، میں اچھا ہو جاؤں گا۔۔۔۔ میں بیماری سے چھٹکارا پا لوں گا، میرے زخم مندمل ہو جائیں گے اور میری توانائی لوٹ آئے گی۔۔۔۔!

میں اپنا محبوب نغمہ دہراؤں گا، دل کے پورے درد اور روح کے تمام کرب کے ساتھ۔۔۔۔ میں جسم کی پوری طاقت کے ساتھ چیخوں گا کہ سکوت کا سینہ شق ہو جائے گا۔۔۔۔ لیکن خدارا مجھ سے یہ مت کہو کہ تم تو نغمہ سرا ہو چکے ہو، اور تمہارا ماضی نہایت درخشاں تھا۔۔۔۔!'' خدارا مجھے ماضی کی آغوش میں نہ پھینکو کہ وہ جہنم سے زیادہ ہولناک ہے۔ ایام رفتہ کی یاد میری روح کو غبار آلو، اور میرے وجود کو شعلوں کے سپرد کر دیتی ہے۔ خدارا مجھے میرا ماضی یاد نہ دلاؤ کہ اس کی یادیں میری روح کی پیاس کو بڑھا دیتی ہیں۔ اور ماضی کی کوتاہیاں گدھ بن کے میرے نفس کو نوچنے لگتی ہیں۔ ماضی کی یاد میرے وجود کو ہر روز ایک ہزار ایک مرتبہ موت کے پاتال میں اتارتی رہتی ہے۔۔۔۔!

میں نثر کے موتی لٹائے اور نظم کے جواہرات بکھرائے، آخر کس لئے؟ اس لئے کہ مجھے اسی کام کے لئے خلق کیا گیا تھا۔۔۔۔ مجھے ایک مختصر سی کتاب لکھنا تھی اور صرف ایک لفظ کہنا تھا، اور اس کے عوض مجھے اذیت کی آف میں جلایا گیا۔ غم کی زنجیروں

میں جکڑا گیا۔۔۔صرف ایک لفظ کہنے کے جرم میں مجھے مایوسی کی مے پلائی گئی اور شکست کی سیج پر سلایا گیا! لیکن وہ لفظ اب تک شرمندہ تکلم نہیں ہوا۔۔۔اسے گویائی کی خلعت نہیں پہنائی گئی اور وہ اب بھی میرے سینے میں بند ہے!۔۔۔اور سنو! میں خاموش نہیں رہ سکتا، اب میں خاموش رہنے پر قادر نہیں رہا اور کچھ وقت جاتا ہے کہ زندگی خود ہی اس لفظ کو میرے ہونٹوں سے چھین کر فضا میں بکھیر دے گی اور ارض وسما کی گونج سے معمور ہو جائیں گے۔

میں اس لفظ کو ادا نہ کر سکا کہ میری زبان میں بچوں کی سی لکنت اور سادگی تھی اور میرے لئے یہ عجیب ندامت آمیز تھا۔پھر میں نے سوچا کہ کب تک یوں ہی رہوں گا، یہ ہر روز کا بے معنی تکلم اور بے مقصد گویائی میری توانائی کو کچل کے دکھ دے گی۔۔۔سو میں نے وہ لفظ ادا کرنے کی کوشش کی، جسے میں اب تک روکے ہوئے تھا۔۔۔لیکن جانتی ہو کیا ہوا۔۔۔؟ اس سے پہلے کہ وہ لفظ میرے ہونٹوں سے باہر آتا، مجھے زمین پر ڈھیر کر دیا گیا۔ میں منہ کے بل گرا اور دھول میرے حلق تک اتر گئی!

اور وہ لفظ، اب بھی میرے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ضمیر صدف میں موتی کی طرح۔۔۔ایک دن آئے گا کہ میں اسے ضرور ادا کروں گا، میرے ہونٹ اسے فضا میں بکھیر دیں گے اور وہ اپنے مقدس پروں کے ساتھ خلائے بسیط میں محو پرواز رہے گا۔۔۔لیکن اس کے پر میرے گناہوں کی دھول سے اٹے ہوئے ہیں، اور جب تک میں انہیں خون جگر کے ساتھ دھو نہیں لیتا اور انہیں منزہ نہیں کر لیتا، اس وقت تک یہ لفظ میرے سینے میں بند رہے گا، ضمیر شب میں شعاع سحر کی طرح۔۔۔اور صداقت کی مشعل بہر حال فروزاں ہو گی!!

جبران

☆☆☆☆☆☆

فلیکس فارس بنام خلیل جبران

1930ء

عزیزی جبران، تمہاری علالت کا سن کر میں اپنی علالت کو بھول گیا ہوں۔ تمہاری بیماری کی خبر نے میرے ہوش وحواس مفلوج سے کر دیئے ہیں اور ہر لحظہ تمہارا تصور قلب و ذہن پر مسلط رہنے لگا ہے۔ آؤ جبران، اپنے وطن کو لوٹ چلیں۔ ہمارا وطن ہمیں بلا رہا ہے۔ اس کی راحت آفریں آغوش ہماری منتظر ہے۔ اس کی سکوں آور فضائیں ہماری راہ دیکھ رہی ہیں اور اس کی سرسبز وادیاں ہمارے لئے ترس گئی ہیں۔ آؤ جبران، جتنی جلدی ہو سکے، اپنے وطن لوٹ چلیں۔ ہمارا وطن ہمیں بلا رہا ہے۔ اس کی گنگناتی ندیاں لہلہاتی وادیاں ہماری آمد کی منتظر ہیں۔ اس کی نغمہ ابا شاریں ہماری راہ دیکھ رہی ہیں۔ جب طوفان درد کسی پر یورش کرتا ہے تو اس کے جسم وجان وطن کی محبت میں پگھلنے لگتے ہیں۔ غم کا خنجر سینے میں پیوست ہوتا ہے تو روح اپنے وطن کے آب وگل کے لئے رونے لگتے ہے۔۔۔۔ وطن کی محبت، ہر محبت سے ارفع اور ہر محبت سے گہری ہے، اس کی شدت متلاطم سمندر کی سی ہے، جو تمام سفینہ ہائے جذبات کے پرخچے اڑا دیتا ہے!

آؤ یا اخی! اپنے وطن لوٹ چلیں۔ جو کچھ ٹوٹ چکا ہے اور جو کچھ لٹ چکا اسے فراموش کر دیں اور جو ابھی ناشکستہ ہے اسے لے کے رخصت ہو جائیں کہ مزید قیام مستحسن اور مناسب نہیں ہے۔ شوروغل کی اس سرزمین کو چھوڑ کے اس جگہ جا بسیں جہاں خاموشیوں کا راج ہے۔ جہاں ہر سو ردائے سکوت پھیلی ہوئی ہے۔ میرا دل تمہارے لئے ایسا ہی اداس ہے جیسا کہ بیروت کے لئے کہ جہاں میرا سب کچھ ہے۔ میں تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کہ لبنان سے۔۔۔۔ لبنان، جو ہماری آرزوؤں اور تمناؤں کا مرجع ہے۔ ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔ ہماری جنت ہے اور ہمارے ایمان ہے!

مجھے بیروت شدت سے یاد آرہا ہے اس کے مقدس صنوبر میری آنکھوں کے سامنے لہرا رہے ہیں۔ میرا بیروت، میرے لبنان کا فردوس ہے۔ آؤ بھائی! اپنے وطن کو لوٹ چلیں۔ بیماری کی پروانہ کرو، اس کی اذیت جھٹک دو کہ وطن کی محبت ہر اذیت اور جذبے پر غالب ہے۔۔۔۔ یہ تہذیب جس نے تمہیں نڈھال کر دیا ہے، میں خود بھی اسی کا زخم خوردہ ہوں۔۔۔۔ اس نے میری روح کی توانائی کو چوس لیا ہے۔۔۔۔ ہم دونوں ایک ہی تہذیب کے زخم خوردہ، مگر ایک ہی تہذیب کے پروردہ بھی ہیں۔ آؤ، اس جھوٹی تہذیب سے دامن چھڑا کے اپنے وطن کو لوٹ چلیں ۔۔۔۔ مقدس صنوبر اور چنار ہمارے منتظر ہیں۔ ان کی سکون آور چھاؤں، ہمارے زخموں کو مندمل کر دے گی۔ میری آنکھیں اپنی دھرتی کی دھول کو ترس گئی ہیں۔ اپنے وطن کی دھول، کہکشاں سے حسین تر ہے۔

یقین جانو جبران، مدت ہوئی میں نے غنچوں کو چٹکتے نہیں دیکھا، اپنے وطن کے گلوں کی مہک کو نہیں سونگھا، اور نغمہ ہائے بلبل کو نہیں سنا، ۔۔۔۔ مدت ہوئی کہ شمیم شب، اور نسیم سحر کے جھونکوں کو محسوس نہیں کیا اور چاندنی کے دودھیا آنچل کو نہیں دیکھا۔

آؤ جبران! اپنے وطن کو لوٹ چلیں، ہمارے وطن کے سبزہ زار اور کوہسار ہمارے منتظر ہیں۔ وقت پر فریب دوست ہے، جانے کب رفاقت کا رشتہ منقطع کر دے اور ہم اس اجنبی سرزمین کہ تہہ میں اتر جائیں!

فلیکس فارس

☆☆☆☆☆☆

ڈرامہ

شداد کی جنت

ارم بلند ستونوں کا شہر

تمثیل کا محل وقوع

اخروٹو اور اناروں کا ایک چھوٹا سا جنگل جس میں نہر العسی Orantes River اور قریہ ہرمل کے مابین ایک پرانا مکان تنہا کھڑا ہے۔

وقت

جولائی 1883ء کی ایک دوپہر

کردار

1. زین العابدین نہاوندی — ایک ایرانی درویش اور صوفی۔ عمر چالیس سال
2. نجیب رحیمی — ایک لبنانی دانشور۔ عمر تیس سال
3. امینا عارفہ — عمر نامعلوم۔ پراسرار اور پیغمبرانہ صفات کی حامل ایک عورت جو کہ اس وادی کی حور کہلاتی ہے۔

جونہی پردہ اٹھتا ہے۔ زین العابدین درختوں کے ایک کنج میں ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر سر جھکائے نظر آتا ہے۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں لمبی چھڑی ہے۔ جس سے وہ زمین میں پر وائرے سے بنا رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں نجیب رحمی گھوڑے پر سوار وارد ہوتا ہے۔ گھوڑے سے اتر تا ہے۔ اس کی لگام ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیتا ہے، اپنے کپڑوں کی گرد جھاڑتا ہے اور زین العابدین کے قریب آتا ہے۔

نجیب رحمی — آپ پر سلامتی ہو عالی جناب۔

زین العابدین — اور تم پر بھی سلامتی ہو۔

(منہ ایک طرف موڑتا ہے اور سرگوشی میں خود کہتا ہے)

سلامتی ہم قبول کریں گے لیکن برتر ؟ یہ ایک الگ معاملہ ہے۔

نجیب رحمی کیا یہ امینا عارفہ کا مسکن ہے؟

زین العابدین ہاں ۔۔۔یہ امینا عارفہ کا مسکن ہے لیکن اس کے متعدد مساکنوں میں سے ایک، جبکہ وہ ان میں سے کسی ایک میں بھی نہیں رہتی تاہم ان سب میں رہتی ہے۔بیک وقت وہ ان سب میں ظہور پذیر ہے اور انہیں بھی۔

نجیب رحمی میں نے بہت سے لوگوں سے دریافت کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کی امینا عارفہ کے بہت سے مسکن ہیں

العابدین اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمہاری معلومات کا ذریعے فقط لوگ ہیں جو اپنی آنکھوں کے بغیر دیکھ نہیں سکتے ، اور نہ ہی اپنے کانوں کے علاوہ وہ سن سکتے ہیں۔امینا عارفہ ہر جگہ ہے،وہ کونسی جگہ ہے جہاں وہ نہیں ہے۔ (اپنی چھڑی سے مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)وہ اس وادی کے ذرے ذرے میں جلوہ افروز ہے۔

نجیب رحمی کیا وہ آج اس جگہ آئے گی؟

العابدین خدا نے چاہا تو وہ آج یہاں ضرور آئے گی۔

نجیب رحمی (زین العابدین کے سامنے ایک چٹان پر بیٹھتے ہوئے اور اس کی ٹکٹکی لگا کر دیکھتے ہوئے)تمہاری داڑھی سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ایرانی النسل ہو۔

العابدین ہاں ۔۔۔میں نہاوند میں پیدا ہوا تھا اور شیراز میں پروان چڑھا، نیشا پور میں تعلیم وتربیت پائی ۔میں نے مشرق سے لے کر مغرب تک دنیا کی سیر وسیاحت کی اور واپس لوٹ آیا میں نے ہر جگہ خود کو تنہا اور اجنبی پایا۔

نجیب رحمی ہم اکثر اپنی ذات سے بھی اجنبی پایا۔

زین یہ سچ ہے (نیب کی تائید کرتے ہوئے) آپ سچ کہتے ہیں۔ میں نے ہزاروں لوگوں سے مجاولہ ومباحثہ کیا اور ان کو اپنے ہی ماحول کا اسیر پایا۔ اس اتنی بڑی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو حقیقت کو جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔

نجیب رحمی (زین کے الفاظ سے متحیر ومتعجب ہوتے ہوئے) کیا درحقیقت انسان اپنی جائے پیدائش کا زندانی نہیں؟

زین جو شخص تنگ دل اور تنگ نظر ہے زندگی کے محدود اور تنگ زاویوں کی طرف راغب ہے اور وہ جس کی نظر کمزور ہے اس ڈگر سے ایک انچ بھی آگے نہیں دیکھتا جو اس نے اپنے لئے تراشی ہے اور نہ ایک انچ اس دیوار سے آگے دیکھتا ہے جو اس نے اپنے کندھوں اور بازوؤں کو آرام دینے کے لیے بنائی ہے۔

نجیب رحمی ہم سب اس قابل نہیں ہیں کہ زندگی کی عظیم گہرائیوں کو اپنے اندر کی آنکھوں سے دیکھ سکیں اور یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ کمزور نظر والے سے یہ تقاضا کیا جائے کہ وہ دور تک دیکھے اور کوئی چیز اس کو دھندلی دکھائی نہ دے۔

زین: آپ بجا کہتے ہیں اور کیا یہ بھی ظلم نہیں کہ ہرے انگوروں سے شراب کشید کی جائے؟

نجیب (لمحہ توقف کے بعد) میں کئی سالوں سے اپینا عارفہ کی حکایات سنتا آرہا ہوں۔ مجھے ان حکایتوں نے مسحور کرلیا ہے اور میں نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ اسے ضرور ملوں گا اور اس کے اسرار ورموز کو پاؤں گا۔

زین دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اپینا عارفہ کے اسرار ورموز سے

آگاہی پاسکے کیونکہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو سمندر کے عمق میں یوں چل سکے کہ وہ باغ میں چہل قدمی کر رہا ہے۔

نجیب میں معذرت چاہتا ہوں جناب کہ اپنا مافی الضمیر آپ سے بیان نہ کرسکا۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ کہاں میں اور کہاں اینا عارفہ چہ نسبت خاک ربا عالم پاک۔ میری کیا بساط ہے کہ اینا عارفہ کے مستور و مخفی الوہی اسرار کا اہل ہوسکوں۔ میری سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ اینا عارفہ کی زبانی بلند ستونوں کے شہر ارم شداد کی کہانی سنوں اور یہ معلوم کروں کے سونے کے اس شہر میں عارفہ نے جو کچھ دیکھا وہ کیسا تھا۔

زین تو پھر آپ کو نیک تمناؤں کے ساتھ اس کی خواب گاہ کے دروازے پر کھڑا رہنا ہوگا۔ اگر وہ کل جاتا ہے تو آپ اپنی منزل مراد کو پائیں گے اور اگر وہ نہیں کھلتا تو آپ کی اپنی ذات ہی مورد الزام ہے۔

نجیب معاف کیجئے گا میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ آپ کے اجنبی الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔

زین وہ بالکل سیدھے سادے ہیں۔ بہ نسبت اس عظیم صلے کے، جو آپ کامیابی کے بعد پائیں گے، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اینا عارفہ لوگوں کے بارے میں ان سے زیادہ کچھ جانتی ہے اور وہ بس ایک باجھانک کر اس کو دیکھ لیتی ہے جو ان کے اندر مخفی و پوشیدہ ہے۔ اگر اس نے آپ کو اہل سمجھا تو روشنی کے منور راستے پر ڈال دے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ آپ کی ذات کو لاشئے سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دے گی۔

نجیب اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنے کے لئے مجھے کیا کہنا چاہئے، کیا کرنا چاہئے۔

زین محض کلام و کردار کے ذریعے اینا عارفہ کے قریب ہونے کی

کوشش کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ وہ نہ تو دیکھتی ہے اور نہ سنتی ہے لیکن اپنی روحانی سماعت سے جو کچھ آپ نہیں کہہ پاتے وہ اس کو بھی سنتی ہے اور جو کچھ آپ کے کردار سے ظاہر نہیں ہوتا اس کو بھی وہ دیکھ سکتی ہے۔

نجیب کتنے دلنشیں اور دانشورانہ ہیں آپ کے الفاظ۔

زین اگر مجھے ایک صدی تک امینا عارفہ سے بات کرنے کی مدت میسر آ جائے تو میں جو کچھ بھی کہوں گا وہ ایک گونگے کی بڑبڑاہٹ کے سوا کچھ بھی نہ ہو گا جو نغمہ جمال بھی گنگنانے کی کوشش کرتا ہے۔

نجیب کیا آپ جانتے ہیں کہ اس پراسرار عورت نے کہاں جنم لیا؟

زین اس کے جسم خاکی نے تو دمشق کے علاقے میں جنم لیا۔ لیکن مادیت سے بالاتر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سینہ یزداں میں ظہور پذیر ہوئی۔

نجیب اس کے والدین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

زین مگر آپ اس سے کیا نتائج اکذ کریں گے کیا آپ کسی عنصر کی سطح کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں؟ کیا آپ محض صراحی کو دیکھ کر اس کے اندر چھلکتی شراب کا ذائقہ بتا سکتے ہیں؟

نجیب آپ بجا فرماتے ہیں۔ تاہم روح اور جسم کے مابین ایک بندھن ضرور ہونا چاہئے جب کہ جسم اور اس کے گردوپیش میں ایک ربط وضبط ہے پھر ایسی صورت میں کہ میں اتفاقات پر یقین نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امینا عارفہ کے اسرار حیات میں غوروخوض کرنے کے لئے اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ معلومات کا حاصل ہونا میرے لئے بڑا کارآمد ہو گا۔

زین بہت خوب کہا جناب عالی! میں اس کی والدہ کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ امینا عارفہ یعنی اپنی اکلوتی بیٹی کی پیدائش پر انتقال کر گئی۔ اس کا باپ شیخ عبدالغنی تھا ایک معروف اندھا پیغمبر

۔۔۔جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی اللہ والوں میں سے تھا اور تصوف میں اپنے وقت کا امام سمجھا جاتا تھا۔خدا اس کی روح پر رحمت کرے، اسے اپنی بیٹی سے والہانہ محبت تھی۔بڑی محبت سے اس کی تعلیم وتربیت کی اس کے دل میں اپنا پورا دل اتار کر رکھ دیا اور جب وہ جوان ہوئی تو اپنا سارا علم وعرفان اسے سونپ دیا۔لیکن حقیقت وواقعیت یہ تھی کہ امینا عارفہ نے اپنے باپ سے جو علم وعرفان پایا اس علم وعرفان کے مقابلے میں بڑا ہی قلیل تھا جو کہ خدا نے امینا عارفہ کو دیا تھا اور پھر امینا عارفہ کے باپ نے اپنی بیٹی کے بارے میں کہا۔"میری زندگی کے اندوہناک اندھیروں میں ایک ایسی روشنی کا ظہور ہوا جس سے میرا سارا جادہ حیات منور ہو گیا" اور پھر جب امینا عارفہ نے تجہیز وتکفین کی اور سات راتیں، سات دن اس کی قبر پر ہی رہی اور روحانی رابطے کے ذریعے اپنے باپ کی روح سے روح کے پوشیدہ اسرار دریافت کرتی رہی۔آخر ساتویں رات اس کے باپ کی روح ظاہر ہوئی۔اپنی قبر کی نگہداشت سے اسے فارغ کیا اور مشرق کی جانب اسے سفر کرنے کا حکم دیا۔امینا عارفہ نے حکم کی تعمیل کی۔

(زین کہتے کہتے رک جاتا ہے۔دو رافق کی طرف دیکھتا ہے اور چند لمحوں کے بعد کہتا ہے)

امینا عارفہ نے سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ صحرا کے قلب میں پہنچ گئی۔جو کہ ربع الخالی Rabh-El-Khali کہلاتا تھا۔اور جہاں تک میرے علم میں ہے کبھی کسی کارواں نے اسے عبور نہیں کیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں کچھ صحرانورد یہاں تک پہنچے۔زائرین یہ سمجھتے تھے کہ امینا عارفہ اسی صحرائے بسیط کی پہنائیوں میں کہیں گم ہو گئی اور بھوک وپیاس کی شدت سے ہلاک ہو گئی۔اسی خیال سے انہوں نے اس کا ماتم کیا، اور واپسی پر دمشق کے لوگوں کو آگاہ کیا جو اس پیغمبر اور اس کی پراسرار بیٹی کو جانتے تھے نوحہ

کناں ہوئے۔ ان کا ماتم کیا لیکن جیسا کہ زمانے کا دستور ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا یا لوگ اس المیہ کو بھول گئے۔ شیخ عبدالغنی اور اس کی پر اسرار بیٹی کی یادان کے دل سے محو ہو گئی تو پانچ سال بعد اپینا عارفہ موصل میں نمودار ہوئی اور اپنی مافوق الفطرت دانائی، علم و عرفان اور حسن و جمال سے لوگوں کے دلوں کو اس طرح مسحور و مسخر کر لیا جیسے پردہ شب میں کوئی شہاب ثاقب نیلگوں آسمان سے ٹوٹ کر چکا چوند پیدا کر دیتا ہے۔

نجیب (قطع کلام کرتے ہوئے۔ حالانکہ وہ زین کی کہانی سے بڑی دلچسپی لے رہا ہے) کیا اپینا عارفہ نے ان لوگوں پر اپنا تشخص ظاہر کیا؟

زین اس نے اپنے بارے میں کسی چیز کا انکشاف نہیں کیا۔ آئمہ فکر اور دانشوروں کے ہجوم میں بے نقاب کھڑی، غیر فانی اور سماوی چیزوں کے اسرار کی پردہ کشائی کرتی رہی۔ اس نے بلند ستونوں کے شہر کی تصویر کشی وعکاسی اس ندرت و قدرت سے کی کہ سامعین کو مبہوت و متحیر کر دیا تو اس کے پرستاروں کی تعداد دن بدن بڑھنے لگی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عاقلان شہر اس سے حسن کرنے لگے۔ عارفہ کے ہر دلعزیزی سے ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے رئیس شہرت سے شکایت کی تو اس نے عارفہ کو اپنے سامنے طلب کیا اور جب وہ اس کے روبرو ہوئی تو رئیس شہر نے اس کے ہاتھوں میں سونے کی تھیلی تھماتے ہوئے حدود شہر سے نکل جانے کو کہا عارفہ نے سونے کی پیش کش ٹھکرا دی قبول نہ کی اور رات کی تاریکی میں اس شہر ستمگر سے نکل گئی پھر اس نے ایک بڑا لمبا سفر کیا۔ وہ قسطنطنیہ، دمشق اور رہومس سے ہوتے ہوئے ٹریپولی جا پہنچی اور جہاں بھی گئی اپنے افکار و خیالات سے دنیا کے قلوب کو روشن کیا۔ گیا دھیان کی شمعیں فروزاں کیں۔ لوگ اس کی ساحرانہ قوتوں سے اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شہر رئیس اور فقیہ کے دل میں کانٹے کی طرح

کھٹکنے لگی ۔وہ جہاں بھی گئی اس کی نہایت شدت سے مخالفت کی گئی۔ بڑوں نے
سے اپنے اقتدار اور وقار کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ اسے اس شہر سے نکال دیا گیا۔
اس طرح یہ دائی جلاوطنی عارفہ کا مقدر بن گئی ۔ اسے ہر جگہ اجنبی اور جلاوطنی سمجھا
گیا۔آخر کار اینا عارفہ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تارک الدنیا ہوگئی اور چند سال
ہوئے یہاں پہنچ گئی۔خود فراموشی میں اس نے یاد الہٰی کے سوا سب کچھ بھلا دیا
۔اور اپنی ذات کے اسرار پر غور وخوض کرنے لگی ۔ یہ اینا عارفہ کی تاریخ کی مختصر
سی تصویر ہے لیکن خدائے بزرگ وبرتر کی عطا کردہ قوت خیر کی برکت سے میں
اینا عارفہ کی ہستی کے بارے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس نے دلوں کو مسحور و مسرور
کرنے والی قوت گویائی سے مجھے وہ گویائی عطا کردی ہے کہ ارضی الفاظ میں اس
کی عظمت وجبروت کو بیان کرسکوں۔

نجیب میں تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں جناب کہ آپ کی ذات گرامی
نے مجھے یہ دلچسپ معلومات فراہم کیں۔ اینا عارفہ کی زیارت کرنے کا
شوق واشتیاق میرے دل میں پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔

زین کٹیلی نظروں سے نجیب کو دیکھتے ہوئے۔ کیا تم عیسائی پیدا ہوئے
ہو یا نہیں؟)

نجیب ہاں ۔۔۔۔میں عیسائی پیدا ہوا بہر حال میں پوری تعظیم وتکریم
کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک دین اور ایک
نام دیا۔لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اتنے سارے مذاہب کا تانا بانا اگر نہ ہوتا تو
سب انسان ایک ہی یقین واعتقاد کے رشتے میں منسلک ہوتے اور بھائی
چارے کی فضا میں سانس لے رہے ہوتے۔

زین آپ کی باتیں بڑی حکیمانہ ہیں اور جہاں تک ایک یقین واعتقاد کا
معاملہ ہے اینا عارفہ سے زیادہ شاید کوئی بھی اس سے واقف نہیں ۔وہ تمام

یقینیات و اعتقادات کا مجموعہ ہے وہ ان قطرات شبنم کی طرح ہے جو سبھی رنگین پھولوں اور پتوں پر گرتی ہے۔جی ہاں۔۔۔وہ صبح کی شبنم کی طرح ہے!

زین ایک نقطہ پر گفتگو بند کردتا ہے اور پوری توجہ کے ساتھ مشرق کی جانب دیکھتا ہے۔معاً کھڑا ہو جاتا ہے اور نجیب کو ہوشیار ہو جانے کا اشارہ کرتا ہے اور سرگوشی میں اسے امینا عارفہ کی آمد سے آگاہ کرتا ہے۔

امینہ عارفہ آ رہی ہے۔۔۔امینا عارفہ۔۔۔اس وادی کی حور۔۔۔اسرار و موز کی دیوی۔۔۔خدا تمہارا نصیبہ یاور کرے۔

نجیب (سرگوشی میں) میرے انتظار و اشتیاق کی طویل اور صبر آزما گھڑیاں اب اپنا صلہ پائیں گی۔

نجیب اپنی پیشانی پر ہاتھ چلاتا ہے تا کہ اپنی تپتپاتی رگوں کو آسودہ کر سکے اور ماحول میں ایک عجیب طرح کا تغیر و تبدل محسوس کرتا ہے اور پھر وہ زین کے ناکامی کے الفاظ یاد کرتے ہوئے یکدم رنجیدہ سا ہو جاتا ہے۔لیکن وہ سنگ مرمر کے ایک مجسمہ کی طرح چپ چاپ کھڑا ہے۔

امینا عارفہ آتی ہے اور ان دونوں مردوں ے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔وہ لمبا حریری چوغہ اوڑھے ہوئے ہے۔اپنے بشرے اور حرکات و سکنات سے وہ عہد قدیم کی کوئی راہبہ محسوس ہوتی ہے۔پرانے زمانے میں جس کی پرستش ہوتی رہی ہو۔اس عہد کی مشرقی عورت تو وہ معلوم ہی نہیں ہوتی۔اس کی عمر کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے۔اس کا چہرہ گو پر شباب ہے لیکن اس سے کوئی بات منکشف نہیں ہوتی جبکہ اس کی آنکھوں سے ہزاروں سال کا کرب اور کسک ہویدا ہے۔

نجیب اور زین احتراماً بے حس و حرکت کھڑے رہتے ہیں جیسے وہ خدائے بزرگ و برتر کے کسی پیغمبر کے حضور میں ہوں!!!

امینا عارفہ نجیب کو یوں دیکھتے ہوئے جیسے اس کی شاندار آنکھوں نے اس

کے دل کو چھید دیا ہے۔نرم آواز مطمئن لہجہ کے ساتھ۔

تم یہاں ہمارے بارے میں کچھ دریافت کرنے آئے ہو لیکن تم اس سے زیادہ ہمارے بارے میں کچھ نہ جان سکو گے جتنا کہ تم اپنے بارے میں جانتے ہو اور یہ کہ تم ہم سے وہی کچھ سن سکو گے جو اپنی ذات سے سن سکتے ہو۔

نجیب (حیرت واستعجاب میں۔اعصابی خوف ظاہر کرتے ہوئے) میں نے اس سے پہلے بھی یہ دیکھا ہے سنا ہے اور اس پر ایمان لایا ہوں۔میں مطمئن ہوں۔

امینا عارفہ تھوڑی قناعت پر قانع نہ ہونا چاہئے۔کیونکہ وہ جو زندگی کے سر چشمہ کو ایک خالی کوزہ سے پاٹنا چاہتا ہے۔پورے دو لبریز کوزوں سے جدا ہو گا

امینا عارفہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے وہ ڈرتے ڈرتے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔اور اس کی انگلیوں کی پوروں کو چومتا ہے۔

تب وہ کسی اندرونی جوش وجذبہ کے تحت اپنا دوسرا ہاتھ زین العابدین کو تھما دیتی ہے اور وہ بھی اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے۔

نجیب اپنے طور پر خوش ہے کہ ابتدا اس نے بڑا اچھا اسلوب پذیرائی اختیار کیا ہے۔

امینا عارفہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

امینا عارفہ (ایک چٹان پر بیٹھتے ہوئے نجیب سے) یہ خدائی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں، بیٹھ جائیں۔

(نجیب اس کے قریب ہی بیٹھ جاتا ہے اور زین بھی ایسا یہ کرتا ہے)

امینا عارفہ (پھر سے نجیب کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے) ہم تمہاری آنکھوں میں خدا کا سچا نور دیکھتے ہیں اور جو کوئی خدا کے سچے نور پر نظر رکھتا ہے۔ہماری اندرونی حقیقت کو دیکھ سکتا ہے۔تم پر خلوص ہو، وفادار ہو،

اور تم صداقت کے شیدائی ہو۔ اس لئے تم صداقت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلوم کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہارے پاس کہنے کو الفاظ ہیں تو ہم ان پر توجہ دیں گے اور اگر تمہارے دل میں کوئی سوال پنہاں ہے تو بڑی خوشی سے ہم سے وہ سوال کرو۔ ہم پوری صداقت سے اس کا جواب دیں گے۔

نجیب میں اس معاملے کے بارے میں دریافت کرنے یہاں آیا ہوں جو ہزاروں لوگوں میں موضوع گفتگو ہے۔ لیکن جب میں آپ کی موجودگی میں اپنے آپ کو پاتا ہوں تو محسوس کرتا ہو جیسے میں صداقت، خدا اور زندگی کا مفہوم و مطلب سمجھ گیا ہوں اور اب میرے لئے باقی سب کچھ غیر ضروری ہے۔ میں ایک ایسے ماہی گیر کی مانند ہوں جو سمندر میں اس امید پر اپنا جال پھینکتا ہے کہ وہ مچھلیوں سے کچھا کچھ بھرا باہر آئے گا۔ لیکن جب وہ اپنا جال باہر کھینچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ قیمتی جواہرات سے لدا پھندا ہے۔

امینا عارفہ میں تمہارے دل میں دیکھ رہی ہوں کے تم نے بلند ستونوں کے شہر ارم میں ہمارے داخلے کے بارے میں کچھ سنا ہے اور اب تم سونے کے شہر کے بارے میں مزید کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو۔

نجیب (خجالت سے تاہم پوری دلچسپی کے ساتھ) ہاں، ۔۔۔۔بلند ستونوں کے شہر ارم کا نام بچپن ہی سے میرے خوابوں کا مرکز و محور رہا ہے۔ اس شہر کی پراسراریت اور ہیبت و جبروت ہمیشہ سے میرے دل میں یہ تحریک پیدا کرتی چلی آئی ہے کہ میں اس شہر کے بارے میں جس قدر بھی ہو سکے، معلومات حاصل کروں۔

امینہ عارفہ اپنا سر اوپر اٹھاتی ہے۔ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے اور ایسی آواز سے بات کرتی ہے کہ نجیب یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آواز خلائے بسیط سے نکل رہی ہو۔

امینا عارفہ ہاں ۔۔۔ہم سونے کے اس شہر میں داخل ہوئے اور اپنی روحوں

کو

نگہتوں سے معمور کرلیا اور ہمارے قلوب اس کے اسرار سے لبریز ہو گئے۔ اس کے لعل و جواہرات سے جیبیں بھر لیں اس کی موسیقی فردوس گوش بنی اور اس کے حسن و جمال سے ہماری آنکھیں منور ہو گئیں اور وہ شخص جو یہ شطہ کرتا ہے کہ ہم نے وہاں جو کچھ دیکھا، سنا اور پایا مشکوک ہے، وہ خود مشکوک ہے۔

نجیب (عجز و انکساری کے ساتھ، دبی آواز میں) میں ایک طفل مکتب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جو تتلا کے بات کرتا ہے، لڑکھڑا رہا ہے اور اپنی ذات کی وضاحت نہیں کرسکتا۔ کیا آپ برائے کرم اپنا بصیرت افروز بیان جاری رکھیں گی اور میرے استفسارات سے درگزر کریں گی؟

امینا عارفہ تم جو چاہو دریافت کرو خدا نے صداقت میں کئی دروازے کھلنے کے لئے رکھے ہیں۔ جو یقین و اعتقاد کے ہاتھوں سے دستک دیتا ہے۔ وہ دروازے اس پر کھولے جاتے ہیں۔

نجیب بلند ستونوں کے شہر ارم میں کیا آپ جسمانی طور پر وارد ہوئیں یا روحانی طور پر؟ کیا یہ سونے کا شہر درخشندہ تابندہ اجزا سے تعمیر کیا گیا ہے؟ کیا واقعی اس جہان سنگ وخشک میں واقع ہے۔ یا یہ ایک تخیلی اور روحانی شہر ہے۔ جس میں خدا کے پیغمبر الواہی وجد و سرور میں پہنچائے جاتے ہیں اور ان کی ارواح کو ابدیت کی ردا اوڑھا دی جاتی ہے؟

امینا عارفہ یہ سب کچھ زمین پر ہے۔ دیکھا اور ان دیکھا۔ یہ صرف روحانی ہے۔ میں سونے کے اس شہر میں جسمانی طور پر داخل ہوئی۔ جو میری عظیم روح کا ایک مادی مظہر ہے جو اور جو کہ سب انسانوں میں ہے اور پھر جسم تو روح کے تحفظ کے لئے ایک عارضی ایک عارضی خول ہے۔ میں ارم میں روح اور جسم کے

اشتراک کے ساتھ داخل ہوئی۔ کیوں کہ جب تک یہ دونوں زمین پر حاضر وموجود ہیں اور وہ جو روح کو جسم سے اور جسم کو روح سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتا ہے اپنے دل کو حقیقت سے دور لے جانا چاہتا ہے۔ پھول اور اس کی خوشبو یک قالب ہیں اور وہ اندھا ہے جو پھول کے رنگ وبو سے انکار کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ پھول فقط خوشبو ایتھر کو متحرک کرتی ہے اور پھر جو جن کے نتھنے بند ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ پھول رنگوں اور تصویروں کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہ کہ ان میں خوشبو ہی نہیں ہے۔

نجیب: تب اس کا مطلب یہ ہوا کے بلند ستونوں کا شہر تو صرف ایک روحانی جگہ ہے۔

امینا عارفہ: (انہاک اور استغراق کے ساتھ) زمان ومکاں، روحانی کیفیتیں ہیں اور جو کچھ دیکھا اور سنا جا سکتا ہے روحانی ہے۔ اگر تم اپنی مادی آنکھیں بند کرلو تو تم اپنے اندرونی وجود کے ذریعے تمام چیزوں کا ادراک کرسکو گے اور تم نفسیاتی اور غیر مرئی دنیا کو دیکھ سکو گے اور وہ سب کچھ جو اس میں ہے اور اس کے دستوروقوانین کے ساتھ خود کو روشناس کرسکو گے اور وہ سب کچھ جو اس میں ہے اس کے دستورو قوانین کے ساتھ خود کو روشناس کرسکو گے اور وہ جس عظمت وجبروت کی حامل ہے اس کو بھی سمجھ سکو گے۔ ہاں۔۔۔ اگر تم اپنے چہرے کی آنکھیں بند کرلو گے اور دل کی آنکھیں کھول لو گے تو پھر تم ہستی کے آغاز وانجام کی ماہیت کو بھی پالو گے وہ انجام جس سے ایک نئ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

نجیب: کیا ہر شخص آنکھیں بند کرکے زندگی اور زندگی کے بارے میں نگی حقیقت کو دیکھنے کی اہلیت رکھتا ہے؟

امینا عارفہ: خدا نے انسان کو خواہش کرنے کی طاقت دی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے، اس کی آنکھوں میں متشکل ہو جاتی ہے اور ایک منزل ایسی بھی آتی ہے کہ انسان اپنی حقیقی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے اور وہ جو اپنی حقیقی ذات کا

مشاہدہ کرتا ہے وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ پوری انسانیت اور تمام اشیاء کے لئے حقیقی زندگی کی صداقت کی مشاہدہ کرتا ہے۔

نجیب: (دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے) تب وہ سب کچھ جس کے متعلق میں اس دنیا میں سوچ سکتا ہوں، سن سکتا ہوں، چھو سکتا ہوں وہ سب کچھ میرے دل میں ہونہاں ہے۔

امینا عارفہ: ہر وہ چیز جو اس پوری کائنات میں ہے تم میں ہے، تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے لئے ہے۔

نجیب: تب میں وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ بلند ستونوں کا شہر ارم کوئی دور نہیں وہ میرے اندر ہے وہ میری ذات میں ہے وہ سب کچھ نجیب رحمی کے تشخص میں ہو پنہاں ہے۔ انسان محشر خیال ہی نہیں محشر وجود بھی ہے۔

امینا عارفہ: یہ درست ہے وہ سب چیزیں جو تخلیقات ہے۔ تم میں اور تم سے قریبی چیزوں میں کئی سرحد نہیں کوئی لکیر نہیں اور تم میں اور ان چیزوں میں جو تم سے دور ہیں، کوئی فاصلہ نہیں ہے اور وہ سب چیزیں پست ہے بلند تر تک، چھوٹی سے بڑی تک تم میں ہے۔

ایک جوہر میں پوری کائنات مخفی ہے۔ دل کی ایک جنبش میں ہستی کے تمام قوانین و ضوابط مضمر ہیں۔ ایک قطرے میں بے کراں سمندر کے اسرار پوشیدہ ہیں۔ تمہارے ایک پہلو میں از زندگی کے تمام پہلو جلوہ گر ہیں۔

(نجیب مضمون کی وسعت سے متحیر و ششدر ہے۔ لمحہ توقف کے بعد کہتا ہے)

نجیب: میں نے سنا تھا کہ صحرائے ربع الخالی کے قلب میں پہنچنے تک آپ نے بڑا لمبا سفر کیا اور پھر آپ کے والد کے روح نمودار ہوئی اور اس خیال سے کہ آپ صحرا کی پہنائیوں میں بھٹکتی نہ پھریں وہ آپ کی خضر راہ بنی اور آپ کو ایسی ڈگر پر ڈالا کہ آپ سونے کے شہر میں پہنچ گئیں۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی

شخص سونے کے شہر تک پہنچنے کی خواہش کرے تو کیا اس کا بھی ان روحانی کیفیتوں کا حامل ہونا ضروری ہے جن کی آپ کی ذات گرامی اس وقت حامل تھی اور پھر کیا یہ ضروری ہے کہ اس کے پاس بھی آپ کا سا علم و عرفان ہو کہ وہ اس جنت ارضی میں داخل ہو سکے جس کی آپ نے سیر کی؟

اینا عارفہ: ہم نے صحرا کا سفر کیا تو بھوک کا سفر کیا تو بھوک اور پیاس کے بڑے دکھ اٹھائے بیابان کی راتیں اور دن اپنی ہونا کیوں سے ہمیں قدم قدم پر ہر اساں کرتے رہے اس سے پہلے کہ ہمیں سونے کے شہر کی دیواریں نظر آئیں ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ایک قدم بھی نہ چلے اور خدا کے اس شہر میں پہنچ گئے۔ انہوں نے کوئی روحانی یا جسمانی دکھ نہ اٹھایا اور اس کے حسن و جمال سے محفوظ ہوئے میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ بہت سوں نے اس مقدس شہر کی سیر و سیاحت کی اور ایسی حالت میں کہ ان کو اپنی جائے پیدائش کو بھی نہ چھوڑنا پڑا۔

(اینا عارفہ ایک لمحہ کے لئے سکوت اختیار کرتی ہے اور پھر درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے۔)

اینا عارفہ: ہر وہ بیج جسے پت جھڑ کا موسم زمین پر گراتا ہے۔ اس کے نشو و نما پانے کے مختلف انداز ہیں اور یوں پتے، پھول اور پھل جنم لیتے ہیں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ وہ کس انداز سے نشو و نما کے ارتقائی مراحل طے کرے ہیں۔ ان کے پس منظر سورج یا ترا کا ایک عظیم عمل کارفرما ہے کہ وہ زمین پر سورج کے سامنے کھڑے رہیں۔

زین: (آگے پیچھے حرکت کرتے ہوئے جیسے وہ اینا عارفہ سے بے حد متاثر ہے) خدا بڑا عظیم ہے۔ سوائے اللہ کے اور کوئی معبود نہیں۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔

(عارفہ کی ہیبت و جبروت سے تھرتھراتے ہوئے۔ سرگوشی میں یہ الفاظ دہرتا ہے)

اینا عارفہ: اور اس کی ذات باری ہمیشہ دائم قائم ہے۔ اس کی ذات ہی کو ثبات ہے جب کچھ نہ تھا وہ تھا اور جب کچھ نہ ہوگا وہ ہوگا۔

نجیب: (عارفہ کو یوں دیکھتا ہے جیسے نشے میں ہے اور عقیدت وارادت سے لبریز آواز سے کہتا ہے) خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔

اینا عارفہ: ہاں۔۔۔خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ سوائے اللہ کے اور کوئی اللہ نہیں۔ تم یہ الفاظ کہتے ہوئے بھی عیسائی ہی رہو گے۔ کیونکہ خدا کے نزدیک لفظوں اور ناموں کی کوئی تفریق نہیں۔ وہ سب کا خدا ہے۔ اس نے سب انسانوں کو بغیر کسی تفریق وتفرقہ کے پیدا کیا ہے۔

نجیب: (اپنا جھکا لیتا ہے۔ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اینا عارفہ کے الفاظ دہراتا ہے اور کہتا ہے) میں خدا کا شکر گزار ہوں جس نے اپنی قدرت سے مجھے پیدا کیا اور سیدھا راستہ دکھایا مجھے اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا اور میں اپنے آخری سانس تک اس کا شکر گزار رہوں گا کیونکہ میں سچائی کی تلاش میں ہوں اور میری ساری عبادت وریاضت اسی کے لئے ہے۔ مجھے خدا سے محبت ہے اور ساری زندگی اس سے محبت کرتا رہوں گا۔

اینا عارفہ: تمہاری زندگی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔

نجیب: میں کیا ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں میں فانی ہوں غیر فانی کیسے ہوسکتا ہوں؟

اینا عارفہ: تم تم ہو۔ خدا کے بندے ہو۔ ہو۔ خدا سے جدا نہیں ہو۔ اس لیے تم سب کچھ ہو۔

نجیب: اینا عارفہ! میں خوب سمجھتا ہوں کہ کن عناصر سے میری تشکیل ہوئی ہے۔ میں کس چیز کا بنا ہوا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اور جب تک میں رہوں گا بس رہوں۔ لیکن میرا یہ خیال کہ میں رہوں گا کہ میری نئی بیداری کو دھندلا نہیں کرے گا؟

امینا عارفہ: (اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھاتی ہے جیسے خلائے بسیط میں کسی چیز کے قریب ہو رہی ہو۔ شفاف اور مستحکم آواز میں کہتی ہے) ہر وہ چیز جو ہے ہمیشہ رہے گی۔ ہمیشہ کے لئے ہے اور خود ہستی ہستی کے دائمی ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن اس احساس کے بغیر جو کہ مکمل ذات کا علم و عرفان ہے۔ انسان زیست اور عدم زیست کے بارے میں کبھی کچھ معلوم نہ کر پائے گا۔ اگر دائمی زندگی کی اصلاح ہو جائے تو یہ اور زیادہ خوبصورت ہو جائے گی اور اگر یہ غائب ہو جاتی ہے تو زیادہ نکھرے ستھرے ہیولے کے ساتھ واپس آئے گی۔ اور اگر یہ محو خواب ہو جاتی ہے تو بہتر بیداری کے خواب دیکھے گی۔ کیونکہ یہ اپنے دوبارہ جنم پر پہلی سے زیادہ عظیم ہو گی۔ مجھے ان پر رحم آتا ہے جو ان عناصر کی ہمیشگی کو سراہتے ہیں۔ جن سے آنکھ بنی ہے لیکن بیک وقت نظر کے مختلف زاویوں پر شبہ کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے آنکھ دیکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مجھے اس شخص سے ہمدردی ہے جو زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ لیکن بیک وقت ایک حصے پر تو یقین و اعتقاد رکھتا ہے اور دوسرے حصے کو مشکوک سمجھتا ہے۔

مجھے وہ لوگ افسردہ و مغموم کرتے ہیں جو ان پہاڑوں اور میدانوں کو تو دیکھتے ہیں جن پر سورج اپنی روشنی پھیلاتا ہے جو بادِ صبا کو ہری بھری شاخوں کو گیت گاتے سنتے ہیں جو پھولوں اور یاسمین کو خوشبو سونگھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ نہیں میں جو کچھ دیکھ اور سن رہا ہوں نابود ہو جائے گا اور جو کچھ سنتا اور محسوس کرتا ہوں یہ بھی نہ رہے گا۔ ایسی کمتریں روح جو دیکھتی ہے اور اپنے بارے میں غم اور مسرت کا غلط اندازہ کرتی ہے اور اپنی ہستی کی بھی نفی کرتی ہے۔ بذات خود بھاپ کی طرح ہوا میں غائب ہو جاتی ہے۔ وہ تاریکی کے متلاشی ہیں اور سچائی کی طرف پیٹھ کئے کھڑے ہیں۔ وہ ایک ایسی جاگتی روح ہے جو اپنی ہستی کی منکر ہے خدا کی دنیا میں زندہ چیزوں کی منکر ہے۔

نجیب: (پرجوش انداز میں) امینا عارفہ! میں اپنی ہستی میں یقین رکھتا

ہوں اور وہ جو آپ کے الفاظ کو سنتا ہے۔لیکن ان میں یقین نہیں رکھتا انسان سے زیادہ مضبوط چٹان ہے۔

عارفہ: خدا نے ہر روح کی راہنمائی کے لئے ایک راہنما رکھا ہے۔لیکن انسان اپنے سے باہر زندگی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اور نہیں جانتا کہ وہ جس زندگی کی تلاش میں ہے وہ اس کے اندر ہے۔

نجیب: کیا جسم انسانی کے باہر کوئی ایسی روشنی ہے جو ہماری ذات کی اتھاہ گہرائیوں کے راستے کو منور کر سکتی ہے۔کیا ہم ایسی قوت رکھتے ہیں جو ہماری روحوں کو متحرک کر دے اور ہم شعور زندگی پیدا کرے اور دائمی علم وعرفان کی نشاندہی کرے؟

(وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔جیسے آگے کچھ کہتے ہوئے خائف ہے۔لیکن فوراً ہی اپنی اس کیفیت پر غالب آتے ہوئے کہتا ہے) کیا آپ کے باپ نے روح کی ارضی قیدو بند کے اسرار آپ کے باپ نے روح کی ارضی قیدو بند کے اسرار آپ پر منکشف نہیں کئے؟

امینا عارفہ: یہ ایک راہ گیر کے لئے بے سود ہے کہ وہ ایک خالی مکان کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے۔انسان عدم ہستی اور اپنے گردو پیش کے مابین خاموش کھڑا ہے۔جو کچھ ہم میں ہے اگر وہ ہم میں نہیں ہے تو جن چیزوں کو ہم اپنا کہتے ہیں۔ہماری اپنی نہیں ہیں میرے باپ کی روح نے مجھے اس وقت پکارا جبکہ میری روح نے اسے پکارا اور میرے ظاہری علوم وعرفان پر وہ منکشف کیا جو میرا باطنی علم وعرفان پہلے ہی جانتا تھا۔اس لئے میں سیدھے سادے الفاظ میں کہوں گی، کیا یہ میری بھوک اور پیاس کے لئے نہیں تھا کہ میں اپنے گردو پیش سے خوراک حاصل نہ کر سکی۔اور کیا یہ میری خواہش وتمنا نہ تھی کہ سونے کے اس شہر کو دیکھو جو میرے اندر ہے۔

نجیب: کیا ہر شخص اس قابل ہے کہ اپنی خواہشوں اور تمناؤں کی تسبیحوں سے وہ دھاگہ بن سکے جو انہیں روح اور رجدا روح سے منسلک کر سکے؟ کیا کوئی ایسا شخص بھی ہے جو روح سے ہمکلام ہو سکے اور اس کی مرضی و منشا کو سمجھ سکے؟

اینا عارفہ: محیط ابدا اور کرہ عرض کے لوگوں کے درمیان ایک مسلسل رابچہ قائم ہے اور یہ سب ان دیکھی قوت و حیات کے حکم کی بجا آوری کرتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی شخص کوئی ایسا فعل کرتا ہے کہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی قوت و ارادہ سے کی ہے۔ لیکن درحقیقت کوئی اور قوت اس کو ایسا کرنے کی طرف راغب کرتی ہے۔ کئی عظیم انسانوں نے اسی ان دیکھی قوت کی اطاعت کرتے ہوئے عزت و عظمت پائی۔ انہوں نے اپنا سب کچھ اسی کو سونپ دیا اور سرفراز ہوئے۔ جیسے وائلن اپنے آپ کو ایک باکملا موسیقار کو سونپ دیتا ہے۔۔۔ مادی دنیا اور روحانی دنیا کے درمیان ایک ڈگر ہے۔ جس پر ہم عالم خواب میں سفر کرتے ہیں۔ وہ انجانی قوت ہمارے ساتھ ہوتے ہے لیکن ہم اس سے ناواقف ہوتے ہیں اور جب ہم اپنے آپ میں واپس لوٹتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں وہ بیج ہیں نہیں ہم کو اپنی روزمرہ کی زندگی کی زمین مین بونا ہوتا ہے۔ اچھے الفاظ اور اچھے کارناموں کے ساتھ، اگر یہ ڈگری ہماری زندگی اور عم زندگی کے مابین نہ ہوتی تو کوئی پیغمبر، کوئی شاعر لوگوں میں نمودار نہ ہوتا (اینا عارفہ کی آواز یکدم دھیمی ہو کر سرگوشی اختیار کر لیتی ہے) میں تو تمہیں سچ کہتی ہوں اور وقت اس کو ثابت کرے گا کہ عالم بالا اور عالم زیریں کے مابین وابستگی ہے وہی وابستگی جو ایک ماں اور اس کے بچے کے درمیان ہے۔ ہم ایک ایسے ماحول میں گھر ہوئے ہیں جو ہمارے لاشور کو متاثر کرتا ہے اور وہ علم و عرفان جو ہمیں فیصلہ کرنے میں محاط رکھتا ہے۔ اور وہ طاقت جو ہماری طاقت کو تقویت دیتی ہے۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ ہمارا شک و شبہ نہ تو اس کی نفی کرتا ہے اور نہ اس کو مستحکم کرتا ہے کہ ہمیں جس چیز پر شک و شبہ ہے اس کے مطیع ہو

جائیں۔۔۔۔اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا خود ستائشی میں محو و مستغرق ہونا ہمیں ہمارے مقصد کی تکمیل سے نہیں روک سکتا۔اور ہمارے اپنی روحانی ہستی سے آنکھیں موند لینا کائنات کی آنکھوں سے ہماری روحانی ہستی کو نہ چھپا سکیں گی۔اگر ہماری روحانی ہستی رواں دواں ہے تو چلنا بند کر دینے کے باوجود ہم بدستور اس کے ساتھ چل رہے ہوں گے۔بے حس و حرکت ہونے کے باوجود ہم اس کے ساتھ بدستور حرکت میں ہوں گے اور خاموش ہو جانے کے باوجود اس کی آواز میں بدستور بول رہے ہوں گے۔۔۔ہماری نیند اس کی بیداری کا اثر ہم پر سے زائل نہیں کر سکتی اور نہ ہماری بیداری اس کے سپنوں کو ہمارے تخیل سے محو کر سکتی۔کیوں کہ ہم اور وہ ایک دنیا میں ملی جلی دو روحانیں ہیں۔ہم اور وہ ایک ہی خول میں مستور دو روحیں ہیں۔ ہم اور وہ دو ہستیاں ہیں جنہیں ابدی اور عظیم تر لاشعور نے متحد کیا ہے جو سب سے بلند و بالا ہے اور اس کی کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہا۔

نجیب: (ہشاش بشاش۔وہ اب امینا عارفہ کے مسکاشفاف کے مطابق سوچتا اور محسوس کرتا ہے) کیا وہ دن کبھی آئے گا جبکہ انسان سائنسی علم، تجربے اور دنیاوی مظاہر کے ذریعے وہ سب کچھ معلوم کر سکے گا جس کی ارواح کو خدا کے ذریعے معرفت ہوتی اور یہ کہ جسے ہمارے قلوب نے خواہش کے ذریعے پہچانا؟۔۔۔۔کیا ہمیں ابدیت حاصل کرنے کے لئے موت کا انتظار کرنا چاہئے؟ کیا وہ دن کبھی آئے گا جبکہ ہم اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے پوروں سے ان عظیم بھیدوں کو پا سکیں گے۔ جنہیں اب ہم اپنے اعتقاد اور یقین کی انگلیوں سے محسوس کرتے ہیں؟

امینا عارفہ: ہاں ایسا ہوگا وہ دن ضرور آئے گا۔لیکن وہ لوگ کتنے لاعلم ہیں جو اپنی کچھ حسیات کے ذریعے تجریدی زندگی کو دیکھتے ہیں اور شکوک وشبہات پر اصرار کرتے ہیں۔یہاں تک کہ ہستی اپنے آپ کو ان کی حسیات پر منکشف کر دیتی ہے۔ کیا حقیقت میں اعتقاد و ایمان دل کا حسن نہیں جیسے کہ نظر آنکھ کا حسن ہے اور وہ

انسان کتنا تنگ نظر ہے جو کوئل کا گیت سنتا ہے اور اس کا شاخوں میں اڑتے دیکھتا ہے۔ لیکن جو کچھ اس نے سنا ہے اور دیکھا ہے اس پر شک کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پرندے کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہے۔ کیا یہ اس کی حسیات کا ایک حصہ نہیں؟ کتنا عجیب ہے وہ انسان جو خواب میں خوبصورت سچائی کو دیکھتا ہے اور تب اس کو کسی ہئیت میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کمیاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ سچائی حقیقت ہے اور خواب خواب ہے.... کتنا اندھا ہے وہ شخص جو کسی معاملے کو صحیح پہلوؤں سے سوچتا سمجھتا ہے۔ لیکن جب اس کی پیائش نہیں کر پاتا اور اس کو اپنی مرضی کے مبابق نہیں ڈھال سکتا تو سمجھتا ہے کہ اس نے جو کچھ بھی سوچا سمجھا بے سود تھا۔ لیکن اگر وہ خلوص کے ساتھ' نیک نیتی کے ساتھ ان واقعات پر غور و خوض کرتا ہے تو یقین کامل کے ساتھ یہ سمجھ پائے گا کہ اس کا عندیہ ایک ایسی ہی حقیقت ہے جیسا کہ آسمان میں پرواز کرتا ایک پرندہ۔

نجیب: کیا ہر تخیل میں جوہر سچائی ہے اور ہر عندیہ حقیقی علم سے معمور ہے؟

امینا عارفہ: درحقیقت .... یہ آئینہ روح کے لئے ناممکن ہے کہ اس تخیل کو منعکس کر سکے جو اس کے سامنے نہ ہو۔ یہ اس جھیل کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنی گہرائیوں میں کسی ایسے پہاڑ کی شکل، کسی ایسے درخت کی تصویر کے لئے یا کسی ایسے بادل کا عکس منعکس کر سکے۔ جس کا کوئی وجود نہ ہو یہ روشنی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کا علم ہوتا ہے آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں ہر صاحب ایمان اپنی اپنی روحانی ذکاوت سے دیکھتا ہے۔ جبکہ ایک سطحی جائزہ لینے والا اپنی مادی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا ایک صاحب ایمان اپنی اندرونی قوت ادراک سے امر حقیقت کو پا جاتا ہے۔ جبکہ بیرون بین اپنے اکتسابی عمل فکر و خیال اور تخیل کی شعبدہ بازی سے اس نقطے کو نہیں پا سکتا.... صاحب ایمان مقدس حقیقتوں سے روشناس ہوتا ہے اپنی گہری حسیات کے ذریعے لیکن کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا جو نہ تو صاحب ایمان ہے اور نہ

رمز حقیقت کو پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک صاحب ایمان اپنی حسیات کو یوں دیکھتا ہے جیسے ایک عظیم دیوار اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور جب وہ جادو عمل پر گامزن ہوتا ہے تو کہتا ہے.... اس شہر کا کوئی دروازہ باہر نہیں کھلتا سب دروازے اندر کی سمت کھلتے ہیں.... (مینا عارفہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ نجیب کی طرح جاتی ہے اور لمحہ توقف کے بعد کہتی ہے)

امینا عارفہ: صاحب ایمان فکر فردا و امروز سے آزاد ہے وہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہر شب و روز میں آسودہ ہے۔ جبکہ کافر کی زندگی عارضی اور چند روزہ ہے.... کتنی قلیل ہے اس شخص کی زندگی جو اپنے ہاتھ اپنے چہرے اور دنیا کے درمیان پھیلاتا ہے اور اپنے ہاتھوں کی لکیروں کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا.... وہ لوگ اپنی ذات ہی سے غیر مانوس ہیں جو اپنی پشت سورج کی طرف کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سوائے اپنے مادی سائے کے زمین پر کچھ نہیں دیکھ سکتے.... یہ بہت دور کے خواب گاہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں اس کے صحن اور گوشوں کی ایک ایک چیز کو یقینی طور پر جانتی ہو.... یہی نہیں بلکہ ان وادیوں اور کوہساروں کے ایک ایک راز سے واقف ہوں۔ میں اس حقیقت کو یقین کی حد تک تسلیم کرتی ہوں کہ میں موجود ہوں اور میرے وجود ی معنی کی پہنائیوں میں بھوک بھی ہے اور پیاس بھی مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں زندگی کے ماکولات و مشروبات کے لئے ان ظروف کو کام میں لاؤں جنہیں میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انسان کی ضیافتوں اور دستر خوانوں پر لات مار کر یہاں چلی آئی ہوں۔ اور ہمیشہ اس وادی کے ہر ذرے میں رہوں گی۔

نجیب: میں آپ کے خیالات و مقاصد کا احترام کرتا ہوں اور میرے دل میں آپ کی گوشہ نشینی کے لئے عزت و احترام ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کی گوشہ نشینی سے ان لوگوں نے ایسی ہستی کو کھو دیا جو انہیں بیدار کرنے اور سربلند کرنے پر قادر تھی۔

امینا عارفہ: (سر ہلاتے ہوئے) یہ لوگ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہیں اور اگت ان میں کوئی فرق ہے تو وہ خارجی مظاہر کا ہے۔ جس کی کوئی حقیقت نہیں....بس فریب ہی فریب کھوٹ ہی کھوٹ چاہے اس پر ملمع کیوں نہ کر دیا جائے اطلس و کمخواب پہن کر اور محلوں اور حویلیوں میں رہ کر بھی جھوٹ سچ نہیں ہو سکتا اور نہ فاصلوں کا ناپنے اور عناصر کو تولنے سے لالچ قناعت میں تبدیل ہو سکتا ہے اور کارخانوں اور مدرسوں میں جرائم فضائل سے نہیں بدل سکتے....اور غلامی....زندگی کی گلامی....ماضی کی غلامی....حال کی غلامی.... مستقبل کی غلامی....اصولوں، خصلتوں اور ملبوسات کی غلامی....مردوں کی غلامی....غرضیکہ غلامی غلامی ہی رہے گی....اس صورت میں بھی جب کہ اس کا چہرہ رنگ دیا جائے یا اس کا لباس تبدیل کر دیا جائے۔ ہاں....غلامی غلامی ہی رہے گی چاہے وہ اپنے آپ کو آزادی کے نام سے کیوں نہ موسوم کرے....(امینا عارفہ کہ چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔اس کی آواز الوہی جوش و جلال سے کپکپانے لگتی ہے)

یہ تمدن اور اس کے سارے مظاہر....یہ تمام اجادات و اختراعات کیا ہیں....سوائے ان نقائص کے جن سے علتوں کو جھوٹی تسلی دے لی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ اضطراب اور اداسی میں گھری ہوتی ہے....اور یہ فاصلوں کی کوتاہی، پہاڑوں اور وادیوں کی ہمواری اور سمندر رو فضا پر تسلط کیا ہے؟ سوائے ان بے کار پھلوں کے جو آنکھوں کو آسودہ کر سکتے ہیں....نہ دل کے لئے غذا بن سکتے ہیں اور نہ روح کی رفعتوں تک پہنچا سکتے ہیں اور پھر رہے وہ معمے اور پہلیاں جنہیں علوم و فنون سے تعبیر کیا جاتا ہے....سو وہ روپہلی زنجیریں ہیں جنہیں انسان ان کی چمک اور جھنکار سے خوش ہو کر گھسیٹتا پھرتا ہے بلکہ یہ وہ پنجرے ہیں جنہیں انسان نے آفرینش کے ابتدائی دور ہی میں پچیوں اور تیلیوں سے بنانا شروع کیا تھا۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ اس کی تمام صناعیوں کا ماحصل صرف یہ ہو گا کہ آپ ہی ان پنجروں میں مقید ہو

جائیں.... انسان کی یہ تمام کارگزاریاں باطل ہیں.... ہاں.... دنیا کی ہر چیز باطل ہے.... اور زندگی کی ان تمام تر لغویات و فضولیات میں صرف ایک چیز کے سوا اور کوئی چیز روح کی رغبت و راحت اور شگفتگی و فریفتگی کا باعث نہیں ہو سکت۔

نجیب: (نہایت عجز و انکسار کے ساتھ) ربہ اینا عارفہ وہ کیا چیز ہے؟

(اینا عارفہ ایک منٹ تک بالکل خاموش رہتی ہے۔ پھر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر شگفتگی و رعنائی پیدا ہوتی ہے اور کپکپاتی ہوئی نہایت شیریں آواز میں کہتی ہے۔)

اینا عارفہ: وہ روح کی بیداری ہے.... وہ اعماق روح کی بیداری ہے.... وہ ایک تصور جو نا آگہی اور بے خبر کے لمحوں میں انسان کے احساسات و محسوسات پر اچانک حملہ آور ہو کر اس کی چشم بصیرت کو وا کر دیتا ہے اور زندگی انسان کی رنگین حلقوں میں گھری ہوئی اور زمین اور خلائے بسیط کے مابین ایک نورانی برج کی طرح ایستادہ نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ضمیر ہستی کے شعلوں میں سے ایک شعلہ ہے جو ایک دم روح کے اندر بھڑکتا ہے ار خس و خاشاک کو جلا کر خاکستر کا ڈھیر بنا دیتا ہے جو اس کا گھراؤ کئے ہوتا ہے پھڑ پھڑاتا ہوا محیط و بسیط فضا میں اڑ جاتا ہے وہ ایک الہامی جذبہ ہے جو قلب انسانی پر وارد ہوتا ہے اور وہ محیرو ۳ حیران ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہر شے کو بے حقیقت سمجھنے لگتا ہے جب اس کے مخالف ہوتی ہے۔ ہر چیز سے کراہت محسوس کرنے لگتا ہے جو اس کا ساتھ نہیں دیتی اور ہر اس شخص کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتا ہے جو اس کے رموز و اسرار کو نہیں سمجھتا۔ وہ ایک مخفی ہاتھ ہے جس نے میری آنکھوں سے پردہ اٹھایا جبکہ میں اپنے رشتہ داروں دوستوں اور ہم وطنوں کے ساتھ اجتماعی زندگی بسر کر رہی تھی اور میں نے حیران و سراسیمہ ہو کر اپنے دل میں کہا.... یہ کون لوگ ہیں اور ان میں سے میری طرف دیکھنے والوں کی حیثیت کیا ہے۔ میں انہیں کیونکر جانتی ہوں اور ان سے کہاں کہاں ملی ہوں میں ان میں کیوں

رہتی ہوں ان کے ساتھ کیوں اٹھتی بیٹھتی ہوں اور ان کے ساتھ میری بول چال کیوں ہے کیا میں ان میں اجنبی ہوں۔ اس بستی میں اجنبی ہوں جیسے زندگی نے میرے لئے آباد کر کے اس کی کنجیاں میرے سپرد کر دی ہیں....!!! یہ ایک بیداری ہے جو روح کی گہرائیوں میں جنم لیتی ہے جو کوئی اس سے آشنا ہے، زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا وہ قیامت تک اس کے اسرار و رموز کو نہ پائے گا۔

نجیب: میں آپ سے مودبانہ دریافت کروں گا کہ کیا آپ نے زہد و عبادت کے لئے گوشہ نشینی اختیار کی ہے؟

اینا عارفہ: نہیں ....میں نے زہد و عبادت کے لئے تنہائی اختیار نہیں کی۔ اس لئے کہ عبادت جو دل کا نغمہ ہے۔ ان گنت چیخوں میں گھری ہوئی ہونے کے باوجود خدا کے کانوں تک پہنچتی ہے اور رہبانیت جس کا دوسرا نام جسم پر جبر کرنا ہے اور اس کی خواہشوں کو کچلنا ہے، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے لئے میرے مذہب میں کوئی گنجائش نہیں۔ خدا نے جسم کو روح کا عبادت کدہ بنایا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی نگہداشت کریں تا کہ وہ جاندار، پاک صاف ہو اور اس کی عبادت کے قابل رہے۔ اس کی الوہیت کا متحمل ہو سکے جو اس میں سکونت پذیر ہے....میرے بھائی! میں نے زہد و عبادت کے لئے گوشہ نشینی اختیار نہیں کی بلکہ اس لئے کی ہے کہ میں لوگوں، ان کے قوانین، ان کی تعلیمات، ان کے رسم و رواج، ان کے خیالات ان کی مصیبتوں اور ان کے ادبار سے بھاگنا چاہتی ہوں.... میں تنہائی کو بہتر سمجھتے ہوئے اس لئے اختیار کیا ہے کہ ان لوگوں کی منحوس صورتیں مجھے دکھائی نہ دیں جو اپنی روح کو بیچ کر اس کی قیمت سے ایسی چیزیں خریدتے ہیں جو عزو شرف میں اس سے کہیں پست ہوتی ہیں۔ میں نے گوشہ نشینی اور خلوت پسند کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ میں ان عورتوں سے ملنا نہیں چاہتی جو اکڑی ہوئی گردنوں کے ساتھ آنکھیں مٹکاتی پھرتی ہیں۔ جن کے ہونٹوں پر تو ہزاروں مسکراہٹیں ہوتی ہیں لیکن دل میں

ایک اور صرف ایک آرزو.... ایک غرض....!! میں نے عزلت کو اس لئے پسند فرمایا کہ ان ادھورے فلسفیوں کی ہم نشینی سے بچ جاؤں جو سپنوں میں علم و حکمت کے سائے دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا علم و معرفت میں وہی درجہ ہے جو دائرہ میں نقطہ کا ہے اور جو بیداری میں حقیقت کی پرچھائیاں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے حقیقت کے محیط و بسیط جو ہر کامل و اکمل کو اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے....! میں نے خلوت نشینی کو اس لئے مناسب سمجھا کہ میں ان جاہلوں کے تپاک سے گھبرا گئی تھی جو مہربانی کو کمزوری، درگزر کو بزدلی اور نخوت و تمکنت کی ایک قسم سمجھتے ہیں....!

میں تجرد کو اپنی زندگی میں اس لئے ڈھالا کہ میری روح ان سرمایہ داروں کے ساتھ رہتے رہتے مضمحل ہو گئی تھی جو خیال کرتے ہیں کہ سورج، چاند اور ستارے ان کے خزانوں سے طلوع ہو کر ان کی جیبوں پر غروب ہوتے ہیں۔ ان لیڈروں سے اکتا گئی تھی، جو قوم کی آرزوؤں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور اس کی آنکھوں میں طلائی دھوم جھونک دیتے ہیں۔ انکے کانوں میں مترنم جو اپنے نفس سے طلب نہیں کرتے۔ میں نے تنہائی کو اپنی زندگی میں اس لئے وارد کیا کہ مجھے آج تک کسی انسان کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں ملی جس کی قیمت میں نے اپنے دل سے ادا نہ کی ہو....!

میں نے گوشہ نشینی کو اس لئے اختیار کیا مجھے اس بلند و بالا اور بھیانک عمارت سے نفرت ہو گئی جسے دنیا تہذیب و تمدن کے نام سے پکارتی ہے۔ وہ عمارت جسے صنعت و صناعی کے کمالات کا آئینہ دار کہا جاتا ہے اور جو انسانی کھوپڑیوں کے ڈھیر پر استوار ہے۔

مجھ میں خلوت پسندی کی اپچ اس لئے پیدا ہوتی کے خلوت میں جسم دل اور روح کے لئے زندگی ہے.... میں نے اس ویرانے کو اپنا مسکن اس لئے بنایا کہ اس کی ویرانی میں سورج کی روشنی، پھولوں کی خوشبو اور جوباروں کا ترنم ہے۔ میں نے کوہساروں کو اپنا مستقر اس لئے قرار دیا کہ میں ان میں بہار کی بالیدگی۔ حرارت

کے حرارے، خزاں، کی ژولیدگی اور موسم سرما کی ویرانی ہے۔ میں نے ان بیابانوں کو اپنا مسکن اس لئے بنایا کہ میں زمین کے اسراء کی معرفت اور بارگاہ خداوندی کا قرب حاصل کرنا چاہتی تھی....!

(اور پھر وہ خاموش ہوگئی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس نے اپنے سر سے اتار پھینکا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک سحر انگیز چمک عود کر آئی۔)

نجیب: (چلنے کی تیاری میں کھڑا ہوتے ہوئے) ربہ امینا عارفہ! کیا میں لوگوں کو یہ بتاؤں کہ بلند ستونوں کا شہر ارم سپنوں کا روحانی شہر ہے؟ اور امینا عارفہ اس میں یقین و اعتقاد کے دروازے سے داخل ہوئی اور اس کی خواہش اور لگن اسے وہاں لے گی؟

امینا عارفہ ہاں.... ان سے کہو.... بلند ستونوں کا شہر ایک حقیقی شہر ہے جو اس دھرتی پر واقع۔ جس میں سمندر، پہاڑ، جنگل اور صحرا ہیں اور یہ سب کچھ بدیہت میں حقیق ہے.... ان سے کہو کہ امینا عارفہ ایک عظیم صحرا کو عبور کرتے ہوئے وہاں پہنچی۔ اس نے پیاس کی عقبتیں برداشت کیں۔ بھوک کی مصیبتیں جھیلیں اور ہولناک سناٹوں میں تنہائی کے عنصریتوں نے اسے قدم قدم پر ڈرایا....!

ان سے کہو کہ سونے کا وہ شہر صدیوں کے جنات نے زندگی کے چمکتے عناصر سے بنایا اور لوگوں کے لئے اسے چھپایا نہیں بلکہ لوگوں نے اپنے آپ کو اس سے چھپالیا اور انہیں یہ بھی بتاؤ کہ وہ شخص جو ارم تک پہنچنے سے پہلے اپنا راستہ کھو دیتا ہے۔ راہبر کو موردالزام ٹھہراتا ہے اور سخت و کرخت راستے کو الزام نہیں دیتا۔ ان سے یہ بھی کہو کہ وہ شخص جو اپنا سچائی کا چراغ نہیں روشن کرتا راستے کو تاریک اور دشوارگزار پائے گا۔

(امینا آسمان کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور اس کے چہرے پر سکون و شیرینی مترشح ہے)

نجیب: (آہستہ آہستہ) امینا عارفہ کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا ہاتھ

اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور سرگوشی میں کہتا ہے (دوپہر ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ تاریکی راستے پر چھا جائے مجھے بستی کی طرف جانا ہے۔)

امینا عارفہ: خدا کی راہنمائی میں تم اپنا راستہ روشنی میں پاؤ گے۔

نجیب: میں اس جلتی ہوئی مشعل کی روشنی میں قدم اٹھاؤں گا جو آپ نے میرے ہاتھ میں تھما دی ہے جسے آندھی بھی نہ بجھا سکے گی۔

(امینا عارفہ شفقت سے نجیب کو دیکھتی ہے۔ اس کے خدو خال سے ماں کی محبت مترشح ہے۔ تب وہ مشرق کی طرف چل دیتی ہے اور درختوں کے جھنڈ میں چلتے ہوئے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔)

زین: کیا میں بستی تک آپ کے ساتھ چلوں؟

نجیب: بڑی خوشی سے میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ یہیں امینا عارفہ کے قریب رہتے ہیں۔ آپ پر مجھے بڑا رشک آیا تھا اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔ ''اے کاش یہ صرف مجھے حاصل ہوتا۔''

زین: ہم سورج سے دور رہ سکتے ہیں۔ لیکن سورج کے قریب نہیں رہ سکتے۔ تاہم ہمیں طاعت و تابش کے لئے سورج کی بڑی ضرورت ہے۔ میں کئی بار ربہ عارفہ کی خیر و برکت ارہدایت لینے یہاں آ چکا ہوں اور بڑا مطمئن یہاں سے واپس گیا ہوں....!!

(نجیب گھوڑے کی لگام درخت کی شاخ سے کھولتا ہے اور گھوڑے کو لئے زین العابدین کے ساتھ جاتا ہے۔)

☆☆☆☆ اختتام ☆☆☆☆